DUE DATE

Cl. No. 811.475 / 16852 Acc. No. 68441

Late Fine Ordinary books 25 p. per day, Text Book Re. 1/- per day, Over night book Re. 1/- per day.

اردو

جلد ۳۱	اپریل ۱۹۵۲ع	نمبر ۲

حالی نمبر

انجمن ترقی اردو پاکستان

کا

سہ ماہی رسالہ

مقام اشاعت کراچی

حالی نمبر

اُردو

جلد ۳۱	اپریل ۱۹۵۲ع	نمبر ۲

فہرست مضامین

حالی نمبر

انجمن ترقی اردو پاکستان کی طرف سے یکم جنوری ۱۹۵۲ء کو یوم حالی منایا گیا تھا۔ اس تقریب پر کئی حضرات نے اپنے مقالے پڑھے تھے۔ ان کے علاوہ چند مہینے پیشتر اکثر اہل قلم حضرات کو لکھا گیا تھا کہ وہ رسالۂ اردو کے حالی نمبر کے لیے مضامین لکھ کر بھیجیں۔ چنانچہ بعض اہل قلم نے ہماری استدعا پر مولانا حالی کی مختلف حیثیتوں سے متعلق مضامین لکھ کر بھیجے ان کا ہم دلی شکریہ ادا کرتے ہیں۔ انہیں مقالات اور مضامین سے اردو کا یہ حالی نمبر مرتب کیا گیا ہے۔ بعض مقالے جو اس نمبر میں بعض وجوہ سے درج نہیں ہوسکے اس کے لیے ہم معذرت چاہتے ہیں۔

اس نمبر کو اپریل کے آخر تک شایع ہونا چاہیے تھا، لیکن انجمن کے پریس کی بعض اہم مصروفیات کی وجہ سے اس کی چھپائی میں قدرے تاخیر ہوگئی جس کا ہمیں افسوس ہے۔

ادارہ

حالی اور انسانیت

(از ڈاکٹر مولوی عبدالحق صاحب مدظلہم)

محنت اور شوق سے علم و فضل حاصل ہوسکتا ہے، شاعر ادیب انشا پرداز بن سکتے ہیں۔ اسی طرح محنت فراست اور بعض اوقات سفارش اور جوڑ توڑ سے جاہ و ثروت، مال و دولت، ناموری اور شہرت حاصل ہوسکتی ہے، اور بڑھتے بڑھتے قوم کی سرداری اور ملک کی فرمان روائی تک دسترس ہوجاتی ہے۔ تاریخ کے اوراق الٹ جائیے، آپ کو ایسے جید عالم و فاضل، ادیب و شاعر، حکیم و فلسفی، بہادر سپہ سالار، نامور فاتح اور سلاطین ملیں گے جن کے کارناموں کو دیکھ کر عقل دنگ رہ جاتی ہے۔ لیکن ان میں کتنے تھے جن میں انسانیت بھی تھی؟

بنی آدم صدہا منزلوں اور دوروں سے گزر کر لاکھوں برس میں موجودہ رتبے کو پہنچا ہے جس پر اسے فخر ہے اور اپنے تئیں اشرف المخلوقات کہتا ہے۔ لیکن ابھی ہزاروں برس درکار ہیں کہ وہ حقیقی معنوں میں انسان کہلا سکے۔ باوجود لاکھوں برس کی جدائی کے اس نے اپنے اصلی اور قدیم بزرگوں اور مورثوں کو نہیں بھلایا۔ اُن کی یاد اُس کے دل میں تازہ ہے اور ایسا سعادت مند ہے کہ اب بھی اُن کے نقش قدم پر چلنے میں اُسے ذرا حجاب نہیں۔ چوں کہ اُسے عقل و دانش بھی عطا ہوئی ہے اس لیے وہ اپنے اوصاف میں اُن سے ہزار گنا برتر و اشرف ہے۔ حیلی فش اور سلوتھ سے زیادہ کاہل، لومڑی سے زیادہ مکار، شیر اور تیندوے سے زیادہ خونخوار، سانپ سے زیادہ زہریلا اور ہوشیار ہے۔ لوگ بعض وقت حیران ہوتے ہیں کہ فلاں شخص سے جو ایسا اچھا اور مہذب ہے، ایسی نازیبا اور ناشایستہ حرکت کیسے صادر ہوئی؟ اس میں حیرانی کی کوئی بات نہیں، انسان اضداد کا مجموعہ ہے۔ اس میں متضاد صفات پائی جاتی ہیں۔ اور جن باتوں کو دیکھ کر ہمیں حیرت ہوتی ہے وہ اُس قدیم دور کی یادگار ہیں جب کہ انسان بہیمیت کی گود میں پرورش پارہا تھا اور باوجود غیر معمولی اور حیرت انگیز ترقی کے وہ اب تک اپنے دل و دماغ کو ان آلایشوں سے پاک نہیں کرسکا جو اُس زمانے سے اس

کے ساتھ لگی چلی آرہی ہیں ۔ ابھی تک وہ پورا انسان نہیں ہے ۔ وہ ذی عقل جانور ہے ۔ وہ جس قدر بہیمیت اور درندگی کے خصائل کم کرتا جائے گا اسی قدر انسانیت کی منزل سے قریب ہوتا جائے گا ۔ لیکن کبھی کبھی ایسی ہستیاں جیسے اولیاءاللہ ، صوفی منش بزرگ ، پاک سیرت ، پاک نہاد انسان اس دنیا میں آجاتی ہیں جو اپنے اخلاق و شمائل اور اپنی بے نفسی اور اپنے عمل سے اندھیری بستی میں اجالا کردیتی ہیں ۔ میں مولانا حالی کا شمار بھی انھی بزرگوں میں کرتا ہوں ۔

اس پانچ صدی کی مدت میں کسی شخص نے ہماری زبان و ادب پر ایسے گرانقدر احسانات نہیں کیے جتنے مولانا حالی نے ۔ وہ ہمارے جدید ادب کے امام و مجتہد ہیں ۔ لیکن میرے دل میں ان کی جس بات کی سب سے زیادہ قدر ہے وہ ان کی انسانیت ہے جو بہت کم انسانوں میں پائی جاتی ہے ۔ نواب عماد الملک (مولوی سید حسین بلگرامی) جو اپنے علم فضل اور ادبی ذوق کی وجہ سے بہت ممتاز تھے ، فرمایا کرتے تھے کہ سرسید احمد خاں کی جماعت میں کوئی شخص انسانیت کے اعتبار سے حالی کے پایہ کا نہ تھا ۔ اور اس خاص بات میں خود سرسید احمد خاں بھی ان کو نہیں پہنچتے تھے ۔

لیکن انسانیت ہے کیا ؟ اس کی تصریح خود مولانا نے فرمائی ہے :—

چیست انسانی ؟ چہیدن از تب ہمسائگاں و ز سموم نجد در باغ عدن پژمان شدن
خواہ دیدن خویشتن را از خوارئی ابنائے جنس در شبستاں تنگ دل از محنت زندان شدن
آتش تعجیلے کہ در کنعاں بسوزد باغ و کشت بر فراز تخت مصر از تاب آں بریاں شدن

یہ تعریف بالکل مولانا حالی پر صادق آتی ہے ۔

میں اس سے پہلے ان کے تذکرے میں اپنا چشم دید واقعہ بیان کرچکا ہوں کہ ۱۹۰۵ء میں اعلا حضرت نظام مرحوم کی جوبلی کی تقریب میں مولانا بھی مدعو کیے گئے تھے اور قدیم نظام کتب میں مقیم تھے ۔ لوگ صبح سے شام تک ان سے ملنے آتے رہتے تھے ۔ " ایک روز کا ذکر ہے کہ ایک صاحب جو علی گڑھ کالج کے گریجویٹ اور حیدرآباد میں ایک معزز عہدے پر فائز تھے ، مولانا سے ملنے آئے ۔ ٹم ٹم پر سوار تھے ۔ سائیس کی جو شامت آئی تو اس نے گاڑی دو قدم آگے جا کھڑی کی ۔ یہ حضرت اس ذرا سی چوک پر آپے سے باہر ہوگئے اور

سارا سارا کٹی ہنٹر اس غریب کے رسید کردے۔ مولانا یہ نظارہ اوپر برآمدہ میں کھڑے دیکھ رہے تھے۔ یہ صاحب مزاج پرسی وغیرہ کر کے رخصت ہوگئے۔ میں دیکھ رہا تھا کہ مولانا کا چہرہ بالکل متغیر تھا وہ برآمدے میں ٹہلتے جاتے تھے اور کہتے تھے " ہائے ظالم نے کیا کیا، اس روز کھانا بھی اچھی طرح نہ کھاسکے۔ کھانے کے بعد قیلولہ کی عادت تھی وہ بھی نصیب نہ ہوئی۔ فرماتے تھے یہ معلوم ہوتا ہے کہ گویا وہ ہنٹر کسی نے میری پیٹھ پر مارے ہیں۔ اس کیفیت سے جو کرب و درد مولانا کو تھا وہ شاید اس بدنصیب سائیس کو بھی نہ ہوا ہوگا "۔

مولوی صاحب ۱۹۱۱ع میں کچھ دنوں کے لیے بغرض علاج فرید آباد چلے آئے تھے جہاں ان کے ایک عزیز ڈاکٹر تھے۔ قیام مولوی سید ہاشمی صاحب کی مردانہ کوٹھی میں تھا۔ اس کوٹھی کے احاطے میں ایک بیوہ وزیرن رہتی تھی۔ ایک شب مولانا نے اس کے بچے کے رونے کی آواز سنی تو کمرے سے باہر آکر وزیرن کو آواز دی کہ بچہ کیوں رورہا ہے۔ اس نے کہا اسے بخار ہے اس کی تکلیف سے رورہا ہے جب کبھی وہ تکلیف سے زیادہ روتا تو باہر آ آکر پوچھتے۔ غرض مولوی صاحب کو رات بھر نیند نہ آئی۔ ڈاکٹر صاحب روز صبح کے وقت مزاج پرسی کے لیے آیا کرتے تھے۔ اس روز علی الصبح مولوی صاحب باہر چبوترے پر آکر کھڑے ہوگئے۔ جب ڈاکٹر صاحب نظر آئے تو وہیں سے پکارکے کہا کہ پہلے وزیرن کے بچے کو دیکھ لو۔ پھر ادھر آنا۔ ڈاکٹر صاحب نے ہرچند کہا کہ بعد میں دیکھ لونگا مگر وہ نہ مانے۔ بچے کو سرسامی تپ تھی۔ ڈاکٹر صاحب اس سے بھی گھبراتے تھے۔ جب ڈاکٹر صاحب نے بچے کو دیکھ لیا تو کہا اس کے لیے دوا لے کر آئیے۔ غرض جب تک انھوں نے بچے کو اپنے سامنے دوا نہ پلوالی ڈاکٹر صاحب کا پنڈ نہ چھوڑا۔

یہ تو خیر اپنی آنکھوں دیکھے واقعات تھے ورنہ ان کے دل کی کیفیت ہی یہی تھی کہ دوسروں کے دکھ درد کو دیکھ کر بے تاب ہوجاتے تھے۔ سچ ہے ہم میں بڑا وہی ہے جو دوسروں کے لیے دکھ سہتا ہے۔ محلے میں کوئی بیمار ہوا یاکسی پریشانی میں مبتلا ہوگیا، یا کسی نے اپنی مصیبت کا حال خط میں لکھ بھیجا تو پریشان ہوجاتے تھے۔ خود کچھ نہ ہوسکتا تو دوسروں سے سفارش کر کے کام لیتے۔ اس میں ان کو ایسا انہماک ہوجاتا تھا گویا یہ مصیبت انھی کے سر آپڑی ہے۔ بعض ایسے شخص جو اپنے کرتوتوں کی وجہ سے بدنام

تھے اور جن کی صحبت سے لوگ بچتے تھے ، جب کسی آفت میں پھنس جاتے اور مولوی صاحب سے رجوع کرتے تو ان کی بھی ویسے ہی خلوص سے مدد کرتے یا سفارش کی ضرورت ہوتی تو سفارش کرتے جیسے دوسروں کی اور کبھی ان میں اور دوسروں میں فرق نہ کرتے ۔ میں ایسے بعض لوگوں کو جانتا ہوں ۔ وہ مولوی صاحب کی نیکی اور احسان کے معترف تھے اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ مولانا کے برتاؤ نے ان کے خیالات اور اعمال میں کچھ نہ کچھ ضرور اصلاح کی ہے ۔ برے اتنے برے نہیں ہوتے اور نہ اچھے اتنے اچھے جتنا ہم سمجھتے ہیں ۔ اکثر یہ ہوتا ہے کہ سوسائٹی اپنے برتاؤ سے بعض خود دار شخصوں کو برا بنادیتی ہے ، جیسے پولیس بعض شریفوں کو باغی اور ڈاکو بنادیتی ہے ۔ نیک برتاؤ کرنے سے وہ بھی اچھے ہوجاتے ہیں اور بعض اوقات اچھوں سے بھی اچھے ۔ کیوں کہ انھیں بدی کا بھی تجربہ ہوتا ہے جو نیکوں کو نہیں ہوتا ۔

مولانا نے غریبوں اور مظلوموں کی ہمیشہ حمایت کی ۔ جس طرح انھوں نے اپنے مسدس میں محنت اور محنت کشوں مزدوروں اور کمیروں کے کام کی عظمت و رفعت کو جن الفاظ میں بیان کیا ہے ایسی کوئی چیز آپ ہمارے اس وقت کے ادب میں نہ پائیں گے ۔ عورتوں کی مظلومی کی حمایت میں جو دو نظمیں مناجات بیوہ اور چپ کی داد ہیں ، ہمارے ادب میں ان کی نظیر نہیں ۔ ایسی نظمیں حالی ہی لکھ سکتے تھے ۔ ان کا کلام درد سے بھرا ہوا ہے اور ہر لفظ دل دردمند کی آواز ہے ۔

دوسرا طبقہ جس سے انھیں بہت ہمدردی تھی وہ طالب علموں کا تھا ۔ وہ مسلمانوں کی تعلیم کے بڑے حامی تھے اور سر سید احمد خاں کی طرح ان کا یہ یقین تھا کہ قوم کی اصلاح و فلاح کی صرف یہی ایک صورت ہے ۔ اسی وجہ سے انھیں علی گڑھ کالج سے خاص تعلق تھا ۔ جہاں تک ممکن ہوتا وہ مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے سالانہ اجلاسوں میں شریک ہوتے ۔ کانفرنس کے جلسوں میں ان کی پر اثر اور پر درد نظموں سے ایک سماں بندھ جاتا تھا ۔ عملاً بھی تعلیم کی اشاعت میں بہت کوشش کی ۔ یہ انھی کی کوشش کا فیض تھا کہ پانی پت جیسے قصبے میں بہت بڑی تعداد تعلیم یافتہ اصحاب کی پیدا ہوگئی ۔ طالب علموں کا بڑا پاس کرتے تھے ۔ خاص کر غریب طالب علموں کی مدد کرنے میں بہت سعی فرماتے ۔ حیدرآباد میں طالب علموں کی امداد کے لیے وہ مجھے ، مولوی عزیز مرزا ، اور نواب عمادالملک کو لکھتے رہتے تھے ۔ اسی طرح

ایجوکیشنل کانفرنس اور دوسرے اداروں سے غریب طلبہ کے وظائف کے لیے کوشش کرتے رہتے تھے۔

ذرا بھی کوئی اچھا کام کرتا یا کسی کی اچھی تحریر یا مضمون نظر پڑجاتا تو اس کی تعریف لکھ کر بھیجتے۔ خاص کر مبتدیوں کی ہمت افزائی کرتے۔ مولانا محمد علی اور مولوی ظفرعلی خاں کی کارگزاریوں سے خوش ہوکر ان کی مدح میں نظمیں لکھیں۔ جب پیسہ اخبار جو ہفتہ وار تھا روزانہ ہوا تو سب سے پہلے منشی محبوب عالم کو مبارک باد کا تار بھیجا۔

وہ کبھی کسی کی دل آزاری نہ کرتے۔ اگر کسی سے کوی لغزش ہوجاتی یا جیسا کہ نوجوانی کا تقاضا ہے جوش میں آکر حد سے آگے نکل جاتے تو اس کے جوش و ہمت کی تعریف کرتے لیکن جو لغزش نظر آتی اس کے متعلق بڑی نرمی اور ہمدردی سے سمجھاتے۔

وہ زیادہ باتیں نہیں کرتے تھے۔ بحث و تکرار سے بہت بچتے تھے۔ کیونکہ اس میں تلخی آجاتی ہے۔ البتہ کسی علمی یا ادبی مسئلے پر گفتگو کرنے میں کبھی عذر نہ ہوتا۔ اس قسم کی بحث میں اگر کوئی سخت یا نا واجب بات کہ بیٹھتا تو اس کا جواب نہ دیتے۔ یہ خاموشی بہت موثر جواب ثابت ہوتی۔ اکثر محلہ کے لوگ یا ملنے والے آجاتے اور ادھر ادھر کی باتیں کرتے رہتے اور اٹھنے کا نام نہ لیتے اور وقت ضائع کرتے، مگر مولوی صاحب کبھی اشارے کنارے سے بھی ناگواری کا اظہار نہ کرتے۔

ان میں بڑا صبر اور قوت برداشت تھی۔ اس کا اندازہ ان کے نواسے عبدالولی کے برتاؤ سے ہوتا ہے جس نے ان کی زندگی تلخ کردی تھی۔ اس لڑکے پر صرع کے دورے پڑتے تھے۔ اس سے وہ بہت چڑچڑا اور بدمزاج ہوگیا تھا۔ بہت تکلیف دیتا اور لڑتا جھگڑتا۔ مولانا اس کی بہت ناز برداری کرتے۔ کیونکہ باپ اس کا انتقال کرگیا تھا اور بیوہ ماں کا اکلوتا بیٹا تھا۔ وہ خفا ہوکے گھر سے نکل جاتا تو یہ ڈھونڈتے پھرتے۔ بعض اوقات بہت سختی سے پیش آتا۔ ایک بار وہ ایسا بگڑا کہ مولوی صاحب کو دھکا دے کر گرادیا۔ کہیں مولوی صاحب کے فرزند خواجہ سجاد حسین نے دیکھ لیا وہ آکر اس پر بہت خفا ہوے اور ایک تھپڑ ماردیا۔ مولوی صاحب کو معلوم ہوا تو بہت ناراض ہوے اور خواجہ سجاد حسین سے ملنا اور بات چیت ترک کردی اور کہا جب تک یہ عبدالولی سے معافی نہ مانگے گا میں اس کی صورت نہ دیکھوں گا۔ آخر مجبور ہوکر انہیں معافی مانگنی پڑی۔ تب جاکر مولوی صاحب کی ناراضی رفع ہوئی۔

نوکروں سے ان کا سلوک بہت مہربانی کا تھا۔ ان سے کبھی درشتی یا بد زبانی سے پیش نہیں آتے تھے۔ اگر کبھی خفا ہوتے یا کوئی سخت لفظ زبان سے نکل جاتا تو نادم ہوتے اور معافی مانگ لیتے۔ ان کا ایک ملازم تھا بہرا، بتھرا، نیچے کے دھڑ کو فالج مارگیا تھا، دیوار کے سہارے چند قدم چل لیتا تھا۔ اس کے بلانے یا بات کہنے میں بہت جھمیلا پڑتا تھا۔ ان اوصاف پر بدمزاج بھی تھا۔ بڑبڑاتا رہتا اور جو جی میں آتا کہہ بیٹھتا۔ ایک صاحب جو ایسے وقت میں حاضر تھے کہنے لگے یہ بہت گستاخ ہے۔ مولوی صاحب نے فرمایا کبھی ہم خفا ہولیتے ہیں کبھی یہ خفا ہولیتا ہے آج اس کی باری ہے۔

وہ کبھی اپنے کلام یا اپنی تالیف تصنیف کا ذکر نہیں کرتے تھے۔ اگر کوئی ایسا موقع آپڑتا اور کچھ کہنا ہی پڑتا تو بادل ناخواستہ دو ایک جملے کہہ دیتے۔ بعض لوگوں کو شوق ہوتا ہے کہ شاعر کی زبان سے اس کا کلام سنیں۔ مولوی صاحب سے بھی اکثر فرمائش ہوتی تھی وہ ہمیشہ معذرت کردیتے۔ ورنہ ہمارے شاعر تو ایسے موقعوں کی تاک میں رہتے ہیں۔ اگر کوئی ان کے کلام کی تعریف کرتا تو بڑی خوبی سے ٹال دیتے، یا کوئی ایسا ذکر چھیڑ دیتے کہ کہنے والے کی توجہ دوسری طرف ہوجاتی۔ ایک صاحب نے ان کے مسدس کی تعریف کرنی شروع کی۔ میں بھی اس وقت موجود تھا۔ مولانا نے میری طرف اشارہ کر کے کہا کہ یہ اسے نہیں مانتے۔ وہ صاحب میری طرف متوجہ ہوگئے اور لگے مجھ سے بحث کرنے۔

ہماری تہذیب میں فروتنی اور انکسار انسانیت کا جز ہے۔ شیخی اور غرور بدتہذیبی اور بے تمیزی کی علامت نہیں زوال کا پیش خیمہ ہے۔ تاریخ اٹھا کر دیکھیے جن قوموں نے اپنی دولت و ثروت اور فتوحات پر غرور کیا تو اسی وقت سے ان کا زوال شروع ہوگیا۔ اشخاص کا بھی یہی انجام ہوتا ہے۔ یہ جو مثل ہے غرور کا سر نیچا بالکل صحیح ہے۔ ابلیس بھی اسی غرور کی وجہ سے مارا گیا۔ مولانا حالی کی سیرت میں انکسار کا وصف خصوصیت سے پایا جاتا ہے۔

ہم نے ہر ادنا کو اعلا کردیا
خاکساری اپنی کام آئی بہت

انکسار کی انتہا ہے کہ وہ اپنی اکثر کتابوں پر مرتبۂ الطاف حسین حالی لکھتے ہیں، مولفہ یا مصنفہ نہیں لکھتے۔ ہمارے اکثر ادیبوں اور خاص کر شاعروں میں شیخی کا عارضہ

ہوتا ہے اور طرح طرح سے اپنی فضیلت اور کمال اور دوسروں کی تنقیص کا اظہار کرتے ہیں۔ تعلی تو خیر شاعر کے لیے جائز ہی کردی گئی ہے۔ حالی نے بھی شعر میں کہوں کہیں تعلی کی ہے لیکن اس میں بھی خاکساری کا پہلو ہاتھ سے جانے نہیں دیا۔

گو کہ حالی اگلے استادوں کے آگے ہیچ ہے
کاش ہوتے ملک میں ایسے ہی اب دو چار ہیچ

مال ہے نایاب پر گاہک ہیں اکثر بے خبر
شہر میں کھولی ہے حالی نے دکان سب سے الگ

کیجے کیا حالی نہ کیجے سادگی گر اختیار
بولنا آئے نہ جب رنگیں بیانوں کی طرح

ہم عصروں کی چشمک مشہور چلی آتی ہے۔ اگرچہ ان کے بعض ہم عصروں نے ان پر طعن و تعریض کی لیکن حالی کبھی اس کے مرتکب نہیں ہوئے۔ بلکہ اُن کے کارناموں کی ہمیشہ تعریف کی، اور اُن کی کتابوں پر ایسے اچھے تبصرے لکھے کہ ایک نقاد کو یہ لکھنا پڑا کہ تنقید پر مروت غالب آگئی ہے۔ جب مولوی نذیر احمد کا ترجمۂ قرآن چھپ کر شائع ہوا تو مولویوں نے اس ترجمے پر بہت اعتراض کیے اور نکتہ چینیوں کو خوب اچھالا۔ اسی زمانے میں چند مولویوں کا ایک وفد مولوی صاحب کی خدمت میں حاضر ہوا اور اُن سے درخواست کی کہ آپ قرآن پاک کا ترجمہ کیجیے ہم آپ کو ہر قسم کی مدد دیں گے۔ مولوی صاحب نے کہا کہ آپ نے پہلے کبھی نہ فرمایا۔ اب جو مولوی نذیر احمد کا ترجمہ شائع ہوا ہے تو آپ کو اس فرمائش کی سوجھی۔

ان کو ایک مشہور اور بڑا شخص سمجھ کر سفارش کرنے والے گھیرے رہتے تھے۔ اپنے ایک عزیز کو کسی ایسی ہی فرمائش کی نسبت لکھتے ہیں:—

"شاید تم اور اور لوگ خیال کرتے ہونگے کہ مجھے ہندستان کی اطراف و جوانب میں ہزاروں آدمی جانتے ہیں۔ اکثر معزز اور ذی اختیار لوگوں سے بھی مجھے تعارف ہے اور اکثر بزرگ میری عزت کرتے ہیں۔ پس میں جس کی جہاں کہیں سفارش کروں گا وہ ضرور کامیاب ہوگا۔ لیکن اے عزیز یہ خیال

بالکل غلط ہے۔ دنیا دارالمعاوضہ اور دارالمکافات ہے۔ جو شخص کسی کے ساتھ کچھ سلوک کرتا ہے کسی نہ کسی عوض اور بدلے کی توقع رکھتا ہے۔ میں تمہاری ایک سفارش اس لیے منظور کرتاھوں کہ مجھے تم سے دس فرمائشیں کرنے کا موقع ملے۔ بس ایسے شخص کی سفارش جس سے کسی طرح کے عوض کی توقع نہ ہو کیونکر کارگر ہوسکتی ہے۔ جب میں زمانے کی نگاہ میں اپنی قدر و منزلت کا اندازہ کرتا ہوں تو اس سے زیادہ نہیں پاتا کہ ایک مشہور گویا جہاں کہیں جاتا ہے، امرا اس کی خاطر کرتے ہیں اور اگر وہ خود نوکری چاہتا ہے تو تھوڑی بہت نوکری بھی اسے ہر جگہ مل جاتی ہے۔ لیکن اگر وہ گھر بیٹھے اپنے دوستوں اور عزیزوں کی سفارش کرنی اختیار کرے تو کوئی اس کی طرف اصلا التفات نہ کرے گا،،

ان میں مروت بہت تھی لیکن اس مروت میں بھی انھوں نے صداقت کو ھاتھ سے نہیں جانے دیا۔ مثلاً اپنے بعض ہم عصروں کی کتابوں کے تبصروں میں اگرچہ بہت کچھ تعریف کی ہے لیکن ان کی بعض خامیوں کی طرف بھی لطیف پیرائے میں اشارے کردیے ھیں۔ خمخانۂ جاوید کے تبصرے میں اس بات کی شکایت کی ہے کہ مسلمان ھندستان میں کئی صدی سے آباد ھیں لیکن انھوں نے سنسکرت اور ھندی کی طرف اتنی توجہ نہیں کی جتنی کرنی چاھیے تھی۔ یا مقدمۂ شعر و شاعری میں جو ھماری شاعری کی حقیقت کھولی ہے اور اس سے اس کی بے راہ روی غیر فطری اور پر تصنع بے اثر شعر گوئی پر جو کاری ضرب لگی اس پر لوگوں نے بڑا ھنگامہ کیا اور لعن طعن کی بوچھاڑ ھونے لگی۔ آخر مولانا کی صداقت غالب آئی۔

غل تو بہت یاروں نے مچایا پر گئے اکثر مان ھمیں

انھوں نے کبھی کسی فرماں روا یا رئیس کی مدح میں کچھ نہیں لکھا۔ البتہ اُن کی مدح ضرور کی جنھوں نے مسلمانوں کی تعلیم و فلاح کے لیے کچھ کیا۔ جب عثمان علی خاں آصف جاہ سابع تخت نشین ھوے تو ھندستان کے شعرا نے مبارک باد اور تہنیت کے بڑے بڑے قصیدے لکھے۔ مولانا کو حیدرآباد سے وظیفہ ملتا تھا، بعض احباب نے اُن سے بھی کہا کہ کچھ لکھیں۔ ایک قطعہ لکھا۔ اس میں اتنی مدح نہیں جتنی نصیحت اور نصیحت کے پردے میں تنبیہ ہے یا دعا ہے۔ چند شعر عرض کرتا ہوں۔

فلک مرتبہ میر عثمان علی خاں مبارک تمھیں مسند شہر یاری
مبارک اب و جد کی تم کو خلافت مبارک دکن کی تمھیں تاجداری

مبارک تمہیں ملک کی گلہ بانی　　مبارک رعیت کی خدمت گزاری
مبارک ہو تم کو وہ دشوار منزل　　جہاں چپے چپے پہ ہے ذمہ داری
مبارک وہ منصب کہ جن کو ملا وہ　　ہوا چین رخصت فراغت سدھاری
مبارک بزرگوں کی میراث تم کو　　جنہوں نے کہ جھیلی ہیں کڑیاں یہ ساری
ارادوں سے جرأت سے ہمت سے جن کی　　زمانے سے ہے بارہا شرط ہاری
مہموں سے ہے جن کی تاریخ رنگیں　　زبانوں پہ ہے ذکر خیر ان کا جاری
ادا کر گئے وہ تو اپنے فرائض　　ہے اب آپ کے عہد دولت کی باری
اب ان کی جگہ آپ کو ہے اٹھانا　　خدا کی امانت کا یہ بوجھ بھاری
جو بے بس ہیں دنیا ہے ان کا سہارا　　جو بے یار ہے ان کی کرنی ہے یاری
نکمے ہیں جو ان کو کام بتانا　　بڑھانا دل ان کا جو ہیں کاروباری
جگانا انہیں نیند کے ہیں جو ماتے　　بڑھانا انہیں علم سے جو ہیں عاری
جو سر زور ہیں ان کی ہے گوشمالی　　جو مظلوم ہیں ان کی ہے غمگساری
سمجھنا ہے یک قوم و ملت کو یکساں　　کہ خصلت ہے یہ زیور شہریاری
مبارک یہ بار گراں تم کو شاہا　　اٹھانے سے ہیں جن کے افلاک عاری

ان کے ہر کام میں اور ان کے کلام میں صداقت اور خلوص پایا جاتا ہے۔ ہمارے ادیبوں اور شاعروں میں صرف وہی ایک ایسی ہستی ہیں جن کے قول اور عمل میں تطابق پایا جاتا ہے۔ جو کہا وہی کیا۔ ان کا کلام ان کی سیرت اور ان کی سیرت ان کا کلام ہے۔

ہم اپنا زیادہ وقت اور اپنی کمائی کا زیادہ حصہ حیوانیت اور بہیمیت میں صرف کرتے ہیں۔ ہم کپڑے صرف تن ڈھکنے اور سردی گرمی سے بچنے کے لیے نہیں پہنتے بلکہ شیخی اور فیشن کے لیے اور اپنے کو ممیز جتانے کے لیے بھی۔ ہم کھانا صرف زندہ رہنے اور صحت کی خاطر نہیں کھاتے بلکہ زیادہ تر مزے کی خاطر کھاتے ہیں جس سے صحت اور زندگی دونوں برباد ہو جاتی ہیں۔ ہم میں سے کتنے ہیں جو انسانیت کی خاطر کام کرتے ہیں۔ ایسا کام جس سے نہ صرف اپنی ذات کو بلکہ دوسروں کو فائدہ پہنچے اور جسے ہم شوق اور محبت سے کریں۔ ہم کام اس لیے کرتے ہیں کہ ہمیں رہنے سہنے کھانے پینے وغیرہ کا سامان ملتا رہے۔ اگر یہ مجبوری اٹھ جائے تو شاید ہزار میں سے ایک بھی کام کرنے کے لیے آمادہ نہ ہو۔ حیوان بھی یہی

کرتا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ انسانیت کم ہوتی جاتی اور حیوانیت بڑھتی جاتی ہے۔ یا شاید انسانیت کا معیار بدلتا جاتا ہے۔

ڈاکٹر اقبال ایک زمانے میں انارکلی میں رہتے تھے۔ اس بازار میں رہنے کے مکان اوپر تھے اور نیچے دکانیں تھیں جہاں ڈاکٹر اقبال رہتے تھے اس کے عین نیچے ایک درزی کی دکان تھی جس نے نہایت جلی حروف میں خوشخط شیشے کے ایک چوکھٹے میں غالب کا یہ مصرع لکھ رکھا تھا " آدمی کو بھی میسر نہیں انسان ہونا "۔ اس درزی کی فراست کا قائل ہونا پڑتا ہے۔ وہ وقت کے تقاضے کو کیا خوب سمجھا اور اس نے اس مصرع سے کیا کام لیا۔ اس نے ہماری ایک مشکل بھی حل کر دی یعنی انسان اب درزی کی دکانوں، ہیر کٹنگ سیلونوں اور بیوٹی کلچر ایوانوں میں بنتے ہیں۔

ہمیں حالی کی زندگی سے کئی بیش بہا سبق ملتے ہیں۔ سب سے پہلی بات صحیح ذوق ہے جو ادب کی جان ہے۔ نہ صرف ادب کی بلکہ انسانی تمدن کی جان ہے۔ حالی نے تمام عمر صحیح ذوق کی تعلیم و تلقین کی۔ دوسرے جس کام کو لیا آپ نے اس شغف اور انہماک سے انجام دیا، گویا اُن کی زندگی کا دار مدار اسی پر ہے۔ وہ صاحب ثروت نہ تھے وہ لیڈر نہ تھے وہ غریب شخص تھے، اُن کے وسائل و ذرائع، بہت محدود تھے۔ تاہم انھوں نے تنہا خاموشی سے وہ کام کیا جو انجمنیں اور ادارے بلکہ حکومتیں بھی انجام نہیں دے سکتیں۔ تیسرے انھوں نے اپنی ہم دردی خلوص و صداقت سے انسانیت کی مثال پیش کی۔

میں اپنے دوستوں رفیقوں اور عزیزوں سے یہ عرض کرتا ہوں کہ اگر وہ دنیا میں انسانیت اور خود داری کی زندگی بسر کرنا چاہتے ہیں، اگر اُن کے دل میں اپنی قوم کی، اپنے پاکستان کی، بنی نوع انسان کی خدمت کرنے کی آرزو ہے تو خود غرضی ہوسنا کی اور اسی قسم کی ادنا خواہشوں اور عادتوں، توہمات و تعصبات کو ترک کر دیں اور محنت مشقت اور برداشت کی عادت ڈالیں۔ یاد رکھیے کہ کوئی بڑا کام محنت و مشقت اور تکلیف اٹھائے بغیر اور بغیر سخت ریاضت اور ایثار کے نہیں ہوسکتا۔ اگر کچھ کرنا ہے تو یہی روش اختیا کرنی ہوگی، ورنہ قدرت کا قانون تادیبی کارروائی کے لیے سرپر کھڑا ہے۔

ڈرو اس سے جو وقت ہے آنے والا۔

حالی کی فارسی شاعری

(از جناب ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خان)

مولانا حالی کی فارسی شاعری پر بحث کرنے سے پہلے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس پس منظر کا جائزہ لیا جائے جو ان کے دل و دماغ پر اثر انداز ہوا اور جس نے انہیں نہ صرف فارسی شاعری کے لیے آمادہ کیا بلکہ اُن تمام قومی اور ادبی خدمات کے لیے تیار کیا جو ہماری تاریخ کی نصف صدی سے متعلق ہیں۔ مولانا حالی سنہ ۱۲۵۲ھ مطابق ۱۸۳۷ع میں پانی پت میں پیدا ہوئے۔ ابھی ۹ برس کے تھے کہ ان کے والد کا انتقال ہوگیا اور چوں کہ والدہ کا دماغ مختل ہوگیا تھا اس لیے بڑے بھائی اور بڑی بہن نے سرپرستی کی۔ اُن کے اور اپنے متعلق مولانا اپنے خود نوشت سوانح ترجمۂ حالی میں لکھتے ہیں کہ :—

" انہوں نے اول مجھ کو قرآن حفظ کرایا۔ اس کے بعد اگرچہ تعلیم کا شوق میرے دل میں حد سے زیادہ تھا مگر باقاعدہ اور مسلسل تعلیم کا کبھی موقعہ نہیں ملا۔ ایک بزرگ سید جعفرعلی مرحوم جو میر ممنون دہلوی کے بھتیجے نیز داماد بھی تھے اور بوجہ تعلق زنا شوئی کے پانی پت میں مقیم تھے اور فارسی لٹریچر، تاریخ اور طب میں ید طولیٰ رکھتے تھے۔ ان سے دو چار فارسی کی ابتدائی کتابیں پڑھیں اور ان کی صحبت میں فارسی لٹریچر سے ایک نوع کی مناسبت پیدا ہوگئی۔ پھر عربی کا شوق ہوا۔ انہی دنوں میں مولوی حاجی ابراہیم حسین انصاری مرحوم لکھنؤ سے امامت کی سند لے کر آئے تھے، ان سے صرف نحو پڑھی۔ چند روز بعد بھائی اور بہن نے جن کو میں بمنزلہ والدین کے سمجھتا تھا تاہل پر مجبور کیا۔ اس وقت میری عمر ۱۷ برس کی تھی .... اب بظاہر تعلیم کے دروازے چاروں طرف سے مسدود ہوگئے۔ سب کی یہ خواہش تھی کہ میں نوکری تلاش کروں مگر تعلیم کا شوق غالب تھا .... میں گھر والوں سے روپوش ہوکر دلی چلا گیا اور قریب ڈیڑھ برس کے وہاں رہ کر کچھ صرف و نحو اور کچھ ابتدائی کتابیں منطق کی مولوی نوازش علی مرحوم سے جو وہاں ایک مشہور واعظ اور مدرس تھے، پڑھیں۔ "

مولانا حالی ۱۸۵۵ع میں دلی سے واپس پانی پت آئے اورکوئی برس، ڈیڑھ برس تک وہیں رہے۔ آخر ۱۸۵۶ع میں ضلع حصار کے کلکٹر کے دفتر میں ایک اسامی پر مقرر ہوے، لیکن ۱۸۵۷ع کے غدر کی وجہ سے پھر پانی پت واپس آنا پڑا اور قریب چار برس کے پانی پت میں بیکاری کی حالت میں رہنا پڑا ۔ لیکن اس عرصے میں پانی پت کے مشہور فضلاء یعنی مولوی قاری عبدالرحمن (المتوفی سنہ ۱۳۱۴ھ = ۱۸[illegible]ع) ، مولوی محب‌اللہ اور مولوی قلندر علی سے منطق ، فلسفہ ، حدیث اور تفسیر وغیرہ پڑھتے رہے ۔ مولانا حالی لکھتے ہیں کہ " جب ان صاحبوں میں سے کوئی پانی‌پت میں نہ ہوتا تھا تو خود بغیر پڑھی کتابوں کا مطالعہ کرتا تھا اور خاص کر علم ادب کی کتابیں شروح اور لغات کی مدد سے اکثر دیکھا کرتا تھا اور کبھی کبھی عربی نظم و نثر بھی بغیر کسی کی اصلاح یا مشورے کے لکھتا تھا مگر اس پر اطمینان نہ ہوتا تھا ۔ میری عربی اور فارسی تحصیل کا منتہا صرف اسی قدر ہے ... "۔ یعنی قریب ۲۴ برس کی عمر تک مولانا حالی کی تعلیم غیر مسلسل طریقے پر ہوتی رہی اور اس وقت تک انھوں نے اردو فارسی ادب کے علاوہ منطق ، فلسفہ ، حدیث ، فقہ اور تفسیر و غیرہ میں بھی خاصی دسترس حاصل کرلی تھی بلکہ اردو ، فارسی اور عربی کی نظم و نثر بھی لکھ لیتے تھے ۔ بلکہ جس زمانے میں (یعنی سنہ ۱۸۵۴ع اور ۱۸۵۵ع میں) مولانا حالی دلی میں تھے اس وقت وہ مرزا غالب کی خدمت میں جا کر ان سے اردو اور فارسی اشعار کے معنی بھی پوچھتے تھے اور جب اردو یا فارسی کی غزل ان کو دکھائی تو انھوں نے یہ بھی فرمایا تھا کہ " اگرچہ میں کسی کو فکر شعر کی صلاح نہیں دیا کرتا لیکن اگر تم شعر نہ کہوگے تو اپنی طبیعت پر سخت ظلم کروگے ۔ " حالی کے لیے غالب کا اس طرح فرمانا کوئی معمولی بات نہیں ہے ۔ انھوں نے حالی کے صحیح مذاق اور مناسب صلاحیت کا اندازہ کرلیا تھا اور جس طرح شاگرد کی صلاحیت کا ایک دو غزل سے صحیح اندازہ کرلینا ایک استاد کی پختہ کاری کے لیے قوی دلیل ہے اسی طرح خود شاگرد کے فطری اور وہبی شاعر ہونے پر یہ واقعہ بہت بڑی حجت ہے ۔ حالی کے اس شاعرانہ مذاق کو جو تقویت بعد میں حاصل ہوئی اس میں نواب شیفتہ کی مصاحبی کو بھی دخل تھا ۔ ضمیمۂ اردو کلیات نظم حالی کے مقدمے میں مولانا اس بات کا اعتراف صاف لفظوں میں کرتے ہیں کہ " حسن اتفاق سے سنہ ۱۸۶۳ع میں (یعنی ۲۶ سال کی عمر میں) میرا تعلق جناب غفراں مآب نواب محمد مصطفےٰ خاں مرحوم و مغفور رئیس دہلی و تعلقہ دار جہانگیرآباد ضلع بلند شہر کی سرکار میں جو کہ فارسی میں حسرتی اور اردو میں شیفتہ تخلص کرتے تھے ، ہوگیا ۔ اور اس تعلق کی وجہ سے

تقریباً آٹھ نو برس (یعنی ۱۸۶۲ع) ان کی خدمت میں رہنے کا اتفاق ہوا ۔ چوں کہ جناب ممدوح کا قیام سنہ ۱۸۵۷ع کے بعد سے زیادہ تر جہانگیرآباد میں رہنے لگا تھا جہاں مخاطب صحیح نہیں تھا اس لیے وہ فکر شعر کی طرف بہت کم متوجہ ہوتے تھے ۔ لیکن جب راقم وہاں رہنے لگا تو رفتہ رفتہ جناب ممدوح کا شوق از سرنو تازہ ہوگیا ۔ اگر چہ اس وقت تک مجھ کو فارسی یا اردو میں فکر شعر کرنے کا بہت ہی کم اتفاق ہوا تھا ، مگر جناب ممدوح کو ادھر متوجہ دیکھ کر میرے دل میں بھی تحریک پیدا ہوئی ۔ ،، اس اقتباس سے جہاں یہ معلوم ہوتا ہے کہ مولانا حالی نے نواب شیفتہ کی صحبت میں فکر شعر کی طرف توجہ کی وہیں یہ بھی ظاہر ہوجاتا ہے کہ خود شیفتہ بھی حالی کی صحبت میں دوبارہ شعر و سخن کی طرف مائل ہوئے اور ان کا شاعرانہ ذوق عود کر آیا ۔ ایک جگہ مولانا حالی نے اسی صحبت کو اور بھی سراہا ہے ۔ ترجمۂ حالی میں لکھتے ہیں ،، ... در حقیقت مرزا (غالب) کے مشورہ و صلاح سے مجھے چنداں فائدہ نہیں ہوا جو نواب صاحب مرحوم کی صحبت سے ہوا تھا ،، ۔ حالی کا یہ بیان سنہ ۱۹۰۱ع کا ہے جب کہ نواب صاحب یا ان کے اواحقین سے کوئی ،،نیازمندانہ ،، تعلق نہیں رہا تھا اس لیے شیفتہ کی یہ تعریفیں کسی خوشامد کی بنا پر نہیں تھیں بلکہ حقیقت کی آئینہ دار تھیں ۔ اور غالب نے تو متعدد مقامات پر شیفتہ کے ذوق کی تعریف کی ہے ۔ خطوط فارسی کے علاوہ جو اشعار اس سلسلے کے ہیں ان میں یہ شعر زیادہ مشہور ہے :—

غالب بہ فن گفتگو نازد بدیں ارزش کہ او
ننوشت در دیوان غزل تا مصطفےٰ خاں خوش نہ کرد (۱)

ایک جگہ ہند کے ،، خوش نفس ،، شعراء کی جہاں فہرست دی ہے وہاں کہتے ہیں :—

ہند را خوش نفسانند سخن ور کہ بود   باد در خلوت شاں مشک فشاں از دم شاں
مومن و نیّر و صہبائی و علوی و اں گاہ   حسرتی ، اشرف و آزردہ بود اعظم شاں
غالب سوختہ جاں گرچہ نیرزد بشمار   ہست در بزم سخن ہم نفس و ہم دم شاں

---

(۱) غالب نے شیفتہ سے یہ امید کی تھی کہ :—

وحشت و شیفتہ اب مرثیہ لکھیں شاید   مرگیا غالب آشفتہ نوا ، کہتے ہیں

لیکن پھر ان کے فراق میں خود ہی لکھنا پڑا :—

غالب اگر بہ بزم شعر دیر رسید دور نیست   کش بفراق حسرتی دل زسخن وری گرفت

لکین یہ سب کے سب شعرا فارسی میں ظہوری ، بیدل ، عرفی ، صائب اور نظیری وغیرہ کے مقلد تھے اور انہوں نے اپنے کلام میں جگہ جگہ ان کے تتبع پر فخر کیا ہے۔ چناں چہ ظاہر ہے کہ حالی نے جس ماحول میں آنکھ کھولیں اس میں تصنع، تکلف ، آورد ، مبالغہ ، ایہام کا زیادہ رواج تھا۔ لوگ انہی خوبیوں پر سر دھنتے تھے اور انہی خوبیوں والوں کو سر آنکھوں پر بٹھاتے تھے۔ اور یہ خوبیاں شروع شروع میں خصوصاً مومن ، غالب اور شیفتہ میں بھی جس حد تک پائی جاتی تھیں وہ اھل نظر سے پوشیدہ نہیں ھیں۔ لیکن رفتہ رفتہ خود انہی شعراء کے یہاں یہ لے پست ہوئی اور اب مبالغے کی جگہ حقیقت نگاری اور سادگی نے لے لی۔ حالی نے شیفتہ کے ذوق کے سلسلے میں کہا ہے کہ "وہ مبالغے کو ناپسند کرتے تھے اور حقائق و واقعات کے بیان میں لطف پیدا کرنا اور سیدھی سادی اور سچی باتوں کو محض حسن بیان سے دل فریب بنانا ، اسی کو منتہائے کمال سمجھتے تھے۔ چھچھورے اور بازاری الفاظ و محاورات اور عامیانہ خیالات سے شیفتہ اور غالب دونوں متنفر تھے .... اُن کے خیالات کا اثر مجھ پر بھی پڑنے لگا اور رفتہ رفتہ ایک خاص قسم کا مذاق پیدا ھوگیا (۱) "۔ حالی کے ذوق کے اس پس منظر پر نظر ڈالنے سے صاف طور پر ان کے شاعرانہ دماغ کا حال معلوم ھوسکتا ہے۔ اور اُن کے ذھنی ارتقاء کی تشکیل بھی سمجھ میں آسکتی ہے۔

حالی کی "باقیات" میں سب سے پہلی چیز اُن کی اردو تضمین ہے جو انہوں نے ۱۱ سال کی عمر میں یعنی سنہ ۱۲۷۲ھ مطابق ۱۸۵۶ع میں حاجی جان محمد قدسی کی مشہور نعتیہ غزل "مرحبا سید مکی مدنی العربی ص" پر لکھی تھی۔ اس میں پانچ بند ھیں اور آخری بند میں حالی کا پرانا تخلص خستہ موجود ہے۔ لکھتے ھیں کہ :—

خستہ خاموش کہ مشکل ہے بہت وصف نبی ہاتھ اٹھا سوئے مدینہ دم حاجت طلبی

پڑھ زباں سے زرہ صدق یہ شعر قدسی سیدی انت حبیبی و طبیب قلبی

آمدہ سوئے تو قدسی پے درماں طلبی

اس کے بعد شیفتہ کی مصاحبت کے زمانے میں جو غزلیں یا کسی اور صنف کا کلام حالی نے لکھا تھا اس کی تعیین فی الحال مشکل ہے، لیکن سنہ ۱۲۸۱ھ مطابق ۱۸۶۴ع کا لکھا ھوا ایک اردو قصیدہ نعت میں ملتا ہے جو غالب کی ایک غزل کی زمین میں ہے۔ مطلع یہ ہے :—

(۱) ترجمۂ حالی

بنے ہیں مدحت سلطان دو جہاں کے لیے　　سخن زبان کے لیے اور زبان دہاں کے لیے

لیکن فارسی کلام میں سب سے قدیم چیز جس کی تعین کی جاسکتی ہے وہ ایک تخمیس ہے غالب کی ایک نعتیہ غزل پر اور جو غالب کی زندگی میں یعنی ۱۸۶۸ع سے پہلے کسی وقت لکھی گئی تھی۔ ابتدا یوں ہوتی ہے :—

اعجاز از خواص لسان محمد است　　عین الحیواۃ گم به دهان محمد است
گر نور و گر هدیٰ که ازان محمد است　　حق جلوه گر زطرز بیان محمد است
آرے کلام حق به زبان محمد است

اس تخمیس میں ۹ بند ہیں اور غالب کی غزل کا ایک شعر جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ظاہری حسن و جمال کی تعریف میں ہے حالی کو بھی اس ظاہری تعریف کے لیے آمادہ کر سکتا تھا لیکن انہوں نے بڑی خوش اسلوبی کے ساتھ ایسا کرنے سے گریز کیا ہے۔ فرماتے ہیں :-

اے خامه وصف قامت معشوق کم نگار　　اے دل سخن زراست قدان درمیان مدار
قمری ز ذکر سرو نفس را نگاه دار　　"واعظ حدیث سایهٔ طوبیٰ فرو گذار
کاین جا سخن ز سرو روان محمد است"

غالب کے زمانے میں وہابی، غیر وہابی کے جھگڑے شروع ہوچکے تھے۔ انہوں نے یہ شعر بہت احتیاط سے کہا تھا کہ :—

تیر قضا هر آئینه در ترکش حق است　　اما کشاد آن ز کمان محمد است

لیکن حالی نے جب اس پر تضمین لکھی تو انہوں نے وما رمیت اذ رمیت ولکن اللہ رمیٰ ..... الخ سے مضمون اخذ کرکے ایک حجت قائم کردی اور غالب سے زیادہ احتیاط برتنے کی کوشش کی۔ فرماتے ہیں :—

لطف خدا ست گر به سر کس نهاد دست　　قهر خداست چون ز سرکس به حمله جست
داند کسے که شد زیِ "ما رمیت" مست　　تیر قضا هر آئینه در ترکش حق است
اما کشاد آن ز کمان محمد است

اسی زمانے کے دو فارسی قطعات بھی یادگار ہیں جن کا ذکر یادگار غالب میں تفصیل کے ساتھ ہے کہ ایک مرتبہ جب کہ مولانا حالی، شیفتہ کے ساتھ غالب سے ملنے گئے اور

غالب کو پنجگانہ نماز پڑھنے کی نصیحت کی تو انہیں کتنا ملال ہوا اور کس طرح یہ غزل حالی کے پاس دوسرے دن بھیجی :-

نہ مقصدے کہ مرآں را رہ خدا گویند   برو برو کہ از آں سو بیا بیا گویند

حالی نے لکھا ہے کہ اس غزل میں غالب نے حالی پر ایک (ایک استاد کی حیثیت سے) طعن و تعریض کی تھی۔ حالی نے اس کے جواب میں ایک فارسی قطعہ ۹ اشعار کا لکھ کر بھیجا۔ چند اشعار اس کے یہ ہیں :-

تو اے کہ رونق پیشینیاں بہم بشکست   ز نظم و نثر تو کاندر زماں ما گفتی
چہ نغمہ ھا کہ بہ قانون ذوق سنجیدی   چہ بذلہ ھا کہ بہ انداز دلربا گفتی
رسید نشۂ عرفاں چو ذکر می راندی   شگفت خاطر یاراں گر از صبا گفتی
دوید ریشہ بہ دلہا چو حرف مہرزدی   دمید نخل تمنا چو از وفا گفتی
گہر بہ بزم فشاندی اگر ثنا خواندی   اثر ز لفظ دماندی اگر دعا گفتی

اسی طرح اور بھی کئی اشعار میں غالب کے ساتھ عقیدت اور محبت کا اظہار ہے اور آخر میں برجستگی اور بے ساختگی اس غضب کی ہے کہ ایک ایرانی بھی آسانی کے ساتھ یہ حسن پیدا نہیں کرسکتا۔ حالی لکھتے ہیں :-

نہ راہ حرف بہ سویت، نہ جاے من بہ دلت   جواب چیست ، اگر پرسم ازکجا گفتی
اگر نہ روے سخن با تو بود ، می گفتم   چگو نہ گفتی وچوں گفتی و چرا گفتی
ولیک شرط ادب نیست بر تو خردہ گرفت   ہر انچہ در حق من گفتۂ بجا گفتی

اس قطعے کے جواب میں غالب نے ایک قطعہ نواب شیفتہ کو لکھا جس میں حالی پر کچھ طنز بھی ہے کہ اگر مجھے دوبارہ پیدا کیا گیا تو میں اس پوری عمر میں صرف دو کام کروں گا۔ ایک تو گزری ہوئی زندگی کی نمازوں کی قضا پڑھ لوں گا دوسرے یہ کہ حالی سے معافی مانگ لوں گا۔ مولانا حالی نے جب یہ قطعہ دیکھا تو شرمندہ ہوئے اور ایک اور قطعہ ۹ شعر کا لکھ کر بھیجا۔ شروع کے اشعار یہ ہیں :-

تو اے کہ عذر فرستادۂ بہ سوئے رہے   سزد کہ جان گرامی بران نثار کنم
نماند قاعدۂ شکر بے ریا بہ جہاں   اساس دوستی از شکوہ استوار کنم
چو شکوہ جز بہ تقاضاے دوستی نبود   ز غیر شکر و شکایت ز دوست دار کنم

ان اشعار میں حالی اپنے استاد کے سامنے سوائے اپنی بے چارگی اور ندامت ظاہر کرنے کے اور کر بھی کیا سکتے تھے - اور شکوہ شکایت کے لیے سوائے حسن تعلیل کے کوئی اور مداوا بھی کیا ہوسکتا تھا ؟ چنانچہ آخر میں بڑے لطیف انداز میں غالب کے مذکورۂ بالا طرز کا جواب خلوص و عقیدت کے ساتھ پیش کرتے ہیں :—

بر آن سرم که اگر مرگ امان دهد زین پس	رکار هائے جہاں خاصه این سه کار کنم
زکرده توبه نمایم ، ز گفته استغفار	دگر مپاس تو پنهان و آشکار کنم

اسی زمانے کی یادگار اور چیزیں بھی ہیں، مثلاً حالی نے ایک عریضے میں غالب کو لکھا ہے کہ انھوں نے نظیری کے ایک شعر کو جو ناقص‌العیار کہا ہے وہ کہاں تک صحیح ہے - لطف دیکھیے کہ غالب نے خود ہی حالی سے فرمایا تھا کہ تم میری رائے سے اتفاق یا اختلاف رکھتے ہو تو لکھو - اس بزرگانہ شفقت میں شاگرد کا امتحان بھی پوشیدہ ہے، تو ساتھ ہی ساتھ شاگرد کی صلاحیت کا اعتراف بھی ہے - حالی پرانے انداز کی فارسی میں لکھتے ہیں کہ :—

" قبله و کعبه - سخنے راکه انداز، دانان گفتار و ادا شناسان معنی از نظر اعتبار انداخته باشند، گو همه از نظیری و عرفی باشد به هیچ تاویل و توجیه طراز قبول نتوان داد، خاصه بسمعی چومنے که بلد راه سخن ومرد این فن خود نیم چگونه این نقش درست تو اند نشست؟ الحق شکسته رابستن وگسسته را پیوستن و پاره را دوختن کاریست بس دشوار و دشوار تر ازان است طرف شدن با استادان فن و مردان کار . . . . " -

یہ تو حالی کا عجز و انکسار ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ نظیری کے جس شعر کو غالب نے " ناقص العیار " قرار دیا تھا اس کی صحیح تشریح حالی جیسا شخص ہی کرسکتا تھا - دیکھیے کس خوبی کے ساتھ تشریح کی ہے کہ اچھے اچھے دماغ کی رسائی آسانی کے ساتھ اس نقطۂ خیال تک نہیں ہوتی - نظیری کا شعر تھا :—

جذب عشقم ق المثل در حسن پیدا ساختن	خضر چاه یوسفم ، از آب حیوان نیستم

خود ہم آپ اس شعر کے معنی پر غور کرلیں کہ آسانی کے ساتھ سمجھ میں آتا ہے یا نہیں ؟ اور اگر آسانی کے ساتھ سمجھ میں نہیں آتا تو اس شخص سے رجوع کریں جس کے متعلق بعض جدید تنقید نگاروں کا دعویٰ ہے کہ یادگار غالب میں اس نے اشعار کی تشریح نہیں کی ہے اور وہ سخن فہم نہیں تھا - حالی لکھتے ہیں :—

" بدانست خاکسار قائل از عشق و حسن دریں شعر عشق و حسن مطلق خواسته است چناں که این هر دو مفهوم از حدیث قدسی کنت کنزاً مخفیاً . . . . الخ

مستفاد می شود ..... قائل دعویٰ می کند و در دعوے خود صادق است که من که از جملهٔ اعیان موجوداتم ، از پیدا ساختن حسن مطلق ، حکم جذب عشق پیدا کردہ‌ام ۔ گویا خضرم که از چاہ یوسف نشان می دهم، نه آن خضر که ز آب حیوان نشان می دهد ۔ پس خود را بجذب عشق و کنز مخفی را که عبارت از حسن مطلق است به یوسف در چاہ افتادہ تشبیه دادہ است و وجوہ تشبیه ظاهر است ۔ فقط ۔ ،،

اسی زمانے کے قریب یعنی سنہ ۱۸۰۲ ع میں حالی نے نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ کے فارسی دیوان پر فارسی میں تقریظ لکھی جو سہ نثر ظہوری کے انداز کی ہے ۔ دیوان سالک اور دیوان قلق پر جو تقریظیں ہیں، وہ بھی اسی انداز کی ہیں ۔ اس زمانے میں حالی پر قدیم فارسی نظم و نثر کا اثر غالب تھا اور وہ ''جادۂ پیمودہ ،، سے ہٹ کر نہیں چل سکتے تھے ۔ کیوں کہ غالب سے زیادہ شیفتہ کے ادبی رجحانات ان کو متاثر کیے ہوئے تھے ۔ اسی لیے میرا خیال ہے کہ ان کے فارسی کلام میں جو غزلیں ہیں وہ اکثر و بیشتر شیفتہ کی مصاحبی کے زمانے ہی کی ہیں ۔ حالی نے خود بھی اعتراف کیا ہے کہ :— ''جناب ممدوح (یعنی شیفتہ) کو ادھر (فارسی یا اردو شاعری کی طرف) متوجہ دیکھ کر میرے دل میں بھی تحریک پیدا ہوتی ۔ فارسی یا اردو کی جس زمین میں وہ غزل لکھتے مجھے بھی اپنے ساتھ شریک فرماتے ۔ ،، (۱) چناں چہ حالی نے اس زمانے میں سب غزلیں قدیم طرز کی کہی تھیں ۔ غزلوں کی تمہید میں بھی کہتے ہیں کہ '' یہ غزلیں اسی زمانے کی ہیں جب کہ خیالات میں کسی قسم کا انقلاب پیدا نہیں ہوا تھا جس قسم کے مضامین غزلوں میں اوپر سے بندھتے چلے آتے تھے اسی روش پر چند غزلیں لکھی گئی تھیں ،، ۔ غزلوں کے اوراق کھولیے ، شروع ہی میں حمد ملتی ہے جو اپنی مثال آپ ہے — لکھتے ہیں :—

ای تکیه به عفو تو خطا را وی ناز به خوف تو رجا را
حاجت کند از طرب فراموش خوانی چو به سوے خود گدا را
جا در دل خویش هم نه یابد رانی ز درت چو پادشا را

(۱) ضمیمہ کلیات حالی کی تمہید ۔ صفحہ ۲ ۔ اسی لیے شیفتہ کی وہ غزلیں جو حالی کی صحبت کے زمانے کی کہی جاسکتی ہیں ، یعنی سنہ ۱۸۶۳ع سے سنہ ۱۸۷۲ ع تک ان کا زمانہ متعین ہوسکتا ہے ۔

علت تو بری و باز بندی	بر صنعت دیگران شفا را
تاثیر ز تست و مصلحت را	بدنام نمودهٔ دوا را

یہ تو سیدھی سادی حمد ہے۔ اب ادبی شان ملاحظہ فرمائیے:—

بازار صبا نمودهٔ گرم	برهم زده طرهٔ دوتارا
با مشعلهٔ هزار امید	پوشیده سراغ مدعا را
در روشنی هزار خورشید	گم ساخته چشمهٔ بقا را
برقے ز آفاق برون جهانده	بر پا زده در رهش گیارا
زهرے به گلوے جان فشانده	لب تشنهٔ خویش کرده مارا
در بردن صبر داده دستے	انداز بتان دل ربارا
از غیر گسسته اندک اندک	دلهاے به الفت آشنارا

دیکھیے، حمد جیسے خشک موضوع کے باوجود کیسی ادبی دلکشی اور تغزل کی چاشنی موجود ہے اور انصاف سے کہیے کہ اس دور میں کسی اور شاعر نے ایسی دلفریب حمد لکھی ہے؟ یہ مبالغہ نہیں ہے بلکہ حقیقت ہے اور حالی کے معاصرین میں یہ چیز کہیں نظر نہیں آتی۔ اب غالب کی ایک دو غزلوں سے اُن کے شاگرد حالی کی غزلوں کا مقابلہ کیجیے۔ غالب کی ایک غزل اس طرح شروع ہوتی ہے:—

دولت به غلط نبود از سعی پشیمان شو	کافر نتوانی شد نا چار مسلمان شو

حالی نے اپنی غزل کے مقطع میں غالب کی اس زمین کے قبول کرنے کا اعتراف کیا ہے:—

حالی به سخن خواهی رفتن ز پئے غالب	دولت به غلط نبود از سعی پشیمان شو

اور شروع کے اشعار یہ ہیں:—

نے نور صفاے دل پنهان شده هر پیدا	ای شب تو بپایان رس، ای مهر درخشان شو
گر بازوے همت هست دستے بگریبان زن	ور پاے ارادت هست لختے به بیابان شو

لیکن یہ غزل حالی کی ابتدائی مشق کی معلوم ہوتی ہے۔ تاہم اس میں ایسے شعر بھی ہیں جو ان کے روشن مستقبل کے آئینہ دار ہیں۔ مثلاً:—

تنهائی و رنجوری وان گه غم مهجوری	اے مشکل من یکشا، ای مردنم آسان شو

ایک اور شعر ہے جس میں وحدت الوجود کا مسئلہ بڑے لطیف انداز میں پیش کیا ہے:—

اے پر تو نقاب از تست، خود جلوہ حجاب از تست
از خود بہ خدا پیوند و ز خویش بر آ، آں شو

اور اس سے پہلے کہتے ہیں کہ :—

شوخی ست کہ نگزارد برملت خود کس را   اے شیخ ز دیں برگرد اے گبر مسلماں شو

لیکن غالب کہتے ہیں کہ :—

ہم خانہ بہ ساماں بہ، ہم جلوہ فراواں بہ   در کعبہ اقامت کن، در بت کدہ مہماں شو

الفاظ میں حالی کے یہاں ابھی پختگی نہیں پیدا ہوئی تھی لیکن مضامین میں (باوجود تنوع کے) دلفریبی پائی جاتی ہے اور انہوں نے کیا خوب کہا ہے کہ تمہارے چہرے پر تم ہی بطور نقاب کے ہو اور تمہارے جلوے کے لیے جب تمہی حجاب بنے ہوئے ہو تو خدا سے خود کو پیوستہ کرلو اور اپنے سے خود کو محو کردو۔ غالب کی ایک غزل ہے :

طاق شد طاقت ز عشقت برکراں خواہم شدن   مہرباں‌شو ورنہ برخود مہرباں خواہم شدن(۱)

حالی نے "خواہم شدن" کے بجائے "خواھد شدن" ردیف اختیار کی ہے اور غالب کے مضمون :—   ع   ملتیں جب مٹ گئیں اجزائے ایماں ہوگئیں

سے ایک نیا مضمون پیدا کیا ہے اور اس طرح اضافہ کیا ہے :—

عشق اگر کیش است ملت ہا کہن خواھد شدن   منبرے ہر گوشہ از دار و رسن خواھد شدن

غالب نے کہا تھا کہ :—

پیش خود بسیارم و بسیار مشتاق تو ام   تا کجا صرف گداز امتحاں خواہم شدن

لیکن حالی نے محبوب کی طویل بے التفاتی پر اس طرح بے تابی ظاہر کی ہے :—

عمرہا شد تشنۂ آب دم شمشیر تست   تیغ برکش ورنہ جاں بیروں زتن خواھد شدن

یہ اسی طرح ہے جس طرح حافظ نے کہا تھا :—

عزم دیدار تو دارد جاں برلب آمدہ   باز گردد یا برآید چیست فرمان شما

---

(۱) غالب کی ایک غزل بالکل حالی کی ردیف و قافیے میں بھی ہے :—

تا ز دیوانم کہ سرمست سخن خواھد شدن   ایں مے از قحط خریداری کہن خواھد شدن

لیکن وہ غزل تعلی اور انجام شاعری سے متعلق ہے۔

غالب نے کہا تھا کہ :-

نظر لگے نہ کہیں اس کے دست و بازو کو   یہ لوگ کیوں مرے زخم جگر کو دیکھتے ہیں

لیکن حالی نے محبوب کو "شکار خویشتن" بنادیا ہے۔ لکھتے ہیں کہ :-

صید تا افگند، محو دست و بازوی خود است   این جوان روزے شکار خویشتن خواهد شدن

حضرت شرف الدین ابو علی قلندر پانی پتی رح کا مشہور شعر ہے :-

من شنیدم یار من فردا رود راہ شتاب   یا الٰہی تا قیامت بر نیاید آفتاب

حالی اپنی بے بسی کو اس طرح بیان کرتے ہیں :-

یار درکوچ است و من خاموش و جان بیتاب گر   جذب در دل نیست کار ز دست من خواهد شدن

غالب اپنے محبوب کے حسن سے مرنے میں بھی زندگی حاصل کرتے ہیں۔ اور بڑی اچھی حجت لاتے ہیں کہ :-

خار و خس هرگه در آتش سوخت، آتش می‌شود   مردم از ذوق لبت چندان که جان خواهم شدن

لیکن حالی اس وقت جوان تھے۔ ان کو اپنے محبوب کے حسن کی وجہ سے روے زمین کی ہرچیز حسین نظر آتی ہے۔ فرماتے ہیں کہ :-

می دمد گل هرکجا پاے نگارین می نهی   جاده چون از سیر باز آئی چمن خواهد شدن

حالی نے دوسرے شعراء کی زمینیں بھی اختیار کی ہیں۔ مثلاً حضرت احمد جام علیہ الرحمۃ کی مشہور غزل ہے :-

درس عشقت را بیانے دیگر است   مرد این رہ را نشانے دیگر است

اسی غزل کا وہ شعر بہت مشہور ہے جس کے سننے سے حضرت قطب الدین بختیار کاکی علیہ الرحمۃ کا وصال ہوگیا تھا۔ یعنی :-

کشتگان خنجر تسلیم را   هر زمان از غیب جانے دیگر است

حالی بھی اسی زمین کو اختیار کرتے ہیں :-

خاکساری از جهان دیگر است   این زمین را آسمانے دیگر است (۱)

اس غزل میں تصوف اور وحدت الوجود کے مضامین کئی جگہ حالی نے باندھے ہیں۔ مثلاً :-

(۱) حالی نے خود لکھا ہے کہ "یہ مصرع نادانستہ، نشاط کے مصرع سے مل گیا ہے"

با هزاروں رنگ باید ساختن یار را هر لحظه شانے دیگر است
دل که بود از چشم مورے تنگ تر چوں نظر کردم جہانے دیگر است

المجاز قنطرۃ الحقیقت بھی ہے :-

من ز رویش حسن معنی دیده ام آنچه دل برده ست آنے دیگر است

حافظ کی ایک غزل ہے :-

عیب رنداں مکن اے زاهدِ پاکیزه سرشت که گناه دگراں بر تو نخواهند نوشت

حالی نے یہ زمین بھی اختیار کی ہے :-

من و از می دوسه پیمانه و یار و لبِ کشت نه ز دوزخ به دلم بیم و نه پروائے بہشت

یہ زمین مشکل ہے لیکن حالی نے اچھے اچھے شعر کہے ہیں۔ غالب نے کہا تھا :-

ہے پرے سرحدِ ادراک سے اپنا مسجود قبلے کو اہل نظر قبلہ نما کہتے ہیں

حالی نے بھی وہی مضمون لیا ہے اور بڑی خوبی سے ادا کیا ہے :-

نرسم از کعبه بری حسرتِ دیدار بخویش اے فرو مانده به نظارۂ سنگ وگل و خشت

یہ شعر بھی اس زمین میں اچھا ہے :-

عمر ها از تو بناکام همی باید زیست و اے آں کس که زکف دامنِ امید نه هشت

اور آخر میں معلّی کے لیے نہیں بلکہ عام مذاق کی پستی کی وجہ سے کہتے ہیں :-

هر رقم را نه بود حسن قبول ارزانی ورنه حافظ چه نوشت ست که حالی ننوشت

اب ایک غزل ایسی سنیے جس کا ہر شعر اپنے اندر بڑی دلکشی رکھتا ہے اور کسی بھی اہل زبان کی غزل کے مقابلے پر رکھا جاسکتا ہے :-

نه گردد از تو هرگز سیری چشم تماشائی اگر بردیده (۱) بنشینی و گر در دل فرود آئی
نه گنجد با تو این هنگامه ها در شان یکتائی تو چندیں عالمے با خویشتن داری و تنہائی
ترا شایاں بود خوبی که بے مهری و محبوبی ترا زیبد دل آرائی که بدخونی و زیبائی

---

(۱) مولانا حالی نے خود ہی اس مصرع پر حاشیہ لکھا ہے کہ ” یہ مصرع حضرت میر حسن ، سجزی کی غزل سے لیا گیا ہے جس کا پہلا مصرع یہ ہے :-

تو نورالعینی ای مه رو ، تو جان جانی ای جاناں

تو چشم و گوش نکشائی و شد بہار نو ارزانی — به گلشن چهره آرائی، به بلبل نغمه پیرائی
نه در بزم مغاں راحت، نه در کوے گذر گاهت — تو اندر بند مستوری چه دانی ذوق رسوائی
سر راه خدا داری و دل سوے قفا داری — تو زاں ساں می روی از ره که پندارند می آئی
گواه بے گناهی هاے خود دارد جهانے را — تو دست خود بخون حالی مسکیں نیا لائی

اس میں کوئی شک نہیں کہ اس غزل میں خسرو اور غالب کی جھلک کئی جگہ دکھائی دیتی ہے، لیکن اس بات سے بھی انکار نہیں کیا جاسکتا کہ یہ غزل اپنے تغزل، اپنی عذوبت اور حلاوت کے اعتبار سے کسی اچھی غزل سے کم نہیں اور اگر حالی کو زندگی جاوید بخشتی ہے تو خود صنف غزل کے لیے بھی مایہ ناز ہے۔ حالی کی نازک خیالی ان اشعار سے بھی ظاہر ہوتی ہے :—

غمش تا جاں بود با جاں ضرور است — وگر خود جاں نباشد آں ضرور است
سوے من آمده مشتاق و ز طرز نگهش — می تراود که بسوئے نگران می آید
عشق از خویشتن بریدن می خواست — حالی از خلق بریدم عبث
حد نظاره آنست که رویش نتواں دید — پیداست که ایں مدعیاں بے بصرانند

نازک خیالی کے علاوہ ندرت بیان بھی ہے۔ مثلاً غالب کا مشہور شعر ہے :—

بندگی میں بھی وہ آزادہ و خودبیں ہیں کہ ہم — الٹے پھر آئے در کعبہ اگر وا نہ ہوا

حالی نے بھی اپنے استاد سے یہی مضمون لیا ہے لیکن اضافہ بھی کیا ہے :—

قدر استادن من بردر خود سنج که من — باز گردم در فردوس اگر وا نبود

اسی طرح اور بھی فرسودہ مضامین ہیں جن میں ندرت بیان سے بڑی لطافت پیدا کردی ہے۔ مثلاً :—

کارم به کسے فتاد کز ناز — پرواے نیاز ما نه دارد
جاں گدازند به لطف و به غضب شاد کنند — هرچه خواهید ازیں عشوه گراں می آید
از چشم جهاں بیں چه زیاں اهل نظر را — هر سوے که ببیند به سوے نگرانند
عجب از خود کنم و سوے فلک می بینم — چوں خدنگ تو بسویم ز کماں می آید
به کنج خانه شمعے می فروزم — که چوں در گیرد اول خانه سوزد

زندگی کے حقائق کی ترجمانی بھی متعدد مقامات پر ملتی ہے۔ مثلاً ایک سیدھی سادی بات کی مثال کس خوبی سے پیش کی ہے۔

شکوہ گر برلب نیاید عاقبت کین می‌شود زخم را درماں نہ باشد چوں کہن خواھد شدن
روے از فرع بہ اصل آر کہ ارباب طلب گل ببینند و سراغ رہ گلشن پرسند
یار باتست گرت جذبۂ گیرائے ہست یوسف آخر رود آں جا کہ زلیخائے ہست

غرض کہ حالی کی غزلیات اپنی خوبیوں کے لحاظ سے بہت سے شاعروں سے اور خصوصاً معاصرین کی غزلوں سے بہتر ہیں، گو کہ تعداد میں کمتر ہیں۔ اور یہ سچ ہے کہ :—

حالی تہ ہر حرف دو صد نکتہ نہفت ست سنجند دریں بزم اگر نکتہ ورانند

یہاں تک تو حالی کی غزل گوئی کے متعلق عرض کیا گیا۔ اس کے بعد (یعنی قدیم طرز کی شاعری کے بعد) جب وہ ۱۲۸۹ ھ مطابق ۱۸۷۲ ع میں لاھور گئے تو آن کے ذھنی رجحانات کا دوسرا دور شروع ھوا۔ ترجمۂ حالی میں لکھتے ھیں کہ :—

" نواب شیفتہ کی وفات کے بعد پنجاب گورنمنٹ بک ڈپو (لاھور) میں ایک اسامی مجھ کو مل گئی جس میں مجھے یہ کام کرنا پڑتا تھا کہ جو ترجمے انگریزی سے آردو میں ھوتے تھے آن کی اردو عبارت درست کرنے کو مجھے ملتی تھی۔ تقریباً چار برس میں نے یہ کام لاھور میں رہ کر کیا۔ اس سے انگریزی لٹریچر کے ساتھ فی‌الجملہ مناسبت پیدا ھوگئی اور نا معلوم طور پر آھستہ آھستہ مشرقی اور خاص کر عام فارسی لٹریچر کی وقعت دل سے کم ھونے لگی۔ "

چنانچہ ہم دیکھتے ھیں کہ اس زمانے میں حالی نے عربی کے اشعار تو اچھی خاصی تعداد میں لکھے لیکن فارسی اشعار بہت ھی کم لکھے۔ یعنی صرف چھ اشعار کے ایک قطعے کی تعیین ھوسکتی ھے جو اس زمانے میں لکھا گیا تھا اور جو ناظم تعلیمات کرنل ھالرائڈ کی خدمت میں بطور شکر گزاری کے پیش کیا گیا تھا۔ وہ قطعہ یہ ھے :—

اولاً شکر آں کہ فرمودی حاجت بندہ بے دریغ روا
ثانیاً عذر آں کی چندیں بار آمدم از پئے صداع شما
آں شنیدی کہ گفت افلاطوں رنج برد آں کہ درنکوئیہا
رنج او عاقبت بہ پایاں رسید لیک نیکی همیشہ ماند بجا
راست گویم گز اردن نتواں حق لطفے کہ کردۂ برما
می کنم ختم بر دعا گفتار کہ نیاید زبندہ غیر دعا

لیکن اس قطعے میں ادبیت نہیں ہے اور اس کی کوئی اہمیت بھی نہیں ہے ۔ اس کے بعد حالی کا فارسی کلام جس کے زمانے کی ٹھیک تعیین ہوسکے، ۱۸۷۷ع سے قبل نہیں ملتا۔ اس سال انہوں نے والی رام پور نواب کلب علی خان (المتوفی ۱۸۸۷ ع) کی مدح میں ایک قصیدہ لکھا تھا جس کے متعلق خود مولانا فرماتے ہیں کہ :—

" اس قصیدے کی تمہید اس وقت لکھی گئی تھی جب کہ شاعرانہ خیالات میں پہلے ہی پہل انقلاب پیدا ہوا تھا اور مبالغے سے نفرت ہونے لگی تھی۔ انھی دنوں میں پہلا دربار قیصری منعقد ہونے والا تھا جو ۱۸۷۷ ع میں بمقام دہلی وقوع میں آیا ۔ جی میں آیا کہ اس تمہید کے بعد کسی ایسے قصیدے کی بنیاد ڈالی جائے جس میں بقدر امکان مبالغے سے احتراز کیا جائے ۔ چوں کہ حضور نواب صاحب ممدوح سے فی الجملہ تعارف تھا اور انہوں نے سرسید کی امداد میں سب سے پہلے سبقت کی تھی اور دربار میں آن کے شریک ہونے کی بھی امید تھی اس لیے آنھی کو اس قصیدے کا ممدوح قرار دیا گیا ۔ ۔ ۔ ۔ "

لیکن ۱۸۷۷ ع میں یہ قصیدہ لکھا گیا اور اس سے تین سال قبل یعنی ۱۲۹۱ ھ مطابق ۱۸۷۴ ع میں وہ نواب موصوف کی مدح میں ایک اردو قصیدہ بھی لکھ چکے تھے جس کا ایک شعر یہ ہے :—

ظل حق کلب علی خان جس کے ظل وجود کے ہند سے لے تا عرب ہیں خاص و عامی گواہ

اس قصیدے میں بھی بےجا تعریف نہیں ہے، یعنی حالی نے فارسی سے پہلے اردو میں ایسے قصیدوں کی بنیاد ڈالی جس میں مبالغے سے احتراز کیا جائے اور یہ آن کی ادبی اولیات میں سے ہے۔ کاش ہمارے شعراء کا اس پر عمل ہوتا تو قصیدہ جیسی شاندار صنف سخن کو زوال نہ آنے پاتا ۔ بہر حال فارسی قصیدہ اس طرح شروع ہوتا ہے :—

سحر کہ پردہ بگرفتند چوں از زشت و از زیبا به دل گفتم کدامیں نعمت آمد برتر از نعما
بگفتا نعمتے در قدر از ہم بیش و کم نبود ز ساقی عین رحمت داں اگر جرعه و گر مینا
ولے فرماں دہ بیدار دل زیں اصل مستثنیٰ است کہ چوں او نعمتے نتواں نشان داد از پے دنیا
صلاح عالمے بارائے او وابستگی دارد جہاں را چوں چمن می داں و اورا چوں چمن پیرا
رعیت را چناں دارد کہ دارد گلہ را چوپاں غم دلہا خورد زاں ساں کہ بازرگاں غم کالا
به روز از داد مظلوماں زمانے بر نیا ساید به شب چوں پاسباں بیدار باشد بر در دلہا
یتیماں را پدروار اشکہا از رخ فرو شوید غریباں را چو غمخواراں بر آرد خارها از پا

اگر بیوہ ز نے نالد ز دست ناخدا ترسے | بہ داد او رسد زاں پیش کاید برلبش آوا
گدایاں را دہد بخشے کہ دلہا را غنی سازد | ضعیفاں را دہد زورے کہ پیراں را کند برنا

آپ نے دیکھا کہ تمہید کتنی حسین ہے کہ صبح دم جب کہ دنیا کی اچھائیوں اور برائیوں پر سے حجابات اٹھادیے گئے تو میں نے عارف سے پوچھا کہ کون سی نعمت اچھی ہوتی ہے، اس نے جواب دیا کہ نعمتوں میں سے ایک کو دوسری پر فضیلت کیوں دی جائے، یہی عین رحمت سمجھو جو ساقی پوری صراحی نہ دے تو کم از کم ایک گھونٹ ہی پلادے، لیکن ایک بیدار دل حکمراں اس سے مستثنیٰ ہے کہ اس جیسی کوئی اور نعمت دنیا میں نصیب نہیں ہوسکتی۔ دیکھیے کتنی پاکیزہ تمہید ہے اور گریز کتنا لطیف ہے کہ بغیر تصنع اور بغیر کسی مبالغے کے، اصل مدح کی طرف آگئے ہیں اور نواب کلب علی خاں مرحوم کے حقیقی اوصاف بالواسطہ بیان کیے گئے ہیں۔ یہ قصیدہ ۸۷ شعروں کا ہے۔ جس میں شروع کے تین شعر تمہید اور گریز سے متعلق ہیں اس کے بعد ایک " بیدار دل حکمراں " کی خوبیاں بیان کی ہیں جو بظاہر عمومیت رکھتی ہیں لیکن حقیقت میں اصل ممدوح سے مخصوص ہیں۔ ایسے " بیدار دل حکمراں " کے اوصاف کے متعلق ۲۳ شعر ہیں۔ پھر لکھتے ہیں کہ :-

اگر خواہی جہاں‌دارے چنیں بیدار دل‌بینی | بیا در خیمہ گاہے دیں پناہ خسرو والا
دریں جشن‌شہنشاہی کہ گوئی حشر اعیاں‌ست | زمانے چشم دل بکشا و بنگر عین اعیاں‌را
سحاب مکرمت‌کلب‌علی خاں آں کہ درعہدش | گدا از شاہ و مفلس از تونگر دارد استغنا

یعنی ایک عام " بیدار دل حکمراں " کے اوصاف کے متعلق دو شعر کی تمہید کے بعد گریز کیا ہے، پھر اس کے اوصاف بیان کرکے خاص ممدوح کی طرف گریز ہے۔ یعنی گریز در گریز ہے۔ یہ چیز بھی حالی کی قوت اختراع سے متعلق ہے۔ اس کے بعد " سخن سنج " ایسی مدح لکھنے پر نازاں ہے لیکن یہاں بھی کوشش کی ہے کہ حقیقی جذبات ہی بیان کیے جائیں تاہم مبالغے بھی کسی قدر پائے جاتے ہیں اور ان کی نوعیت کسی قدر نوابی آداب سے ہے۔ مثلاً لکھتے ہیں کہ :-

(۱) بہ جائے کز ہنرمنداں کسے را در شمار آرند | ہنر نالد کہ من لی غیرہ فی الدین والدنیا
(۲) بہ وقتے کز جواں مرداں عزیزے درحساب آید | کرم گوید کہ مالی دونہ ملجیٌ ولا ما ویٰ
(۳) بہ بزمے کز سخن سنجاں حدیثے درمیاں افتد | سخن برخویشتن بالد کہ ماز شاہ و شاہ ازما

اس کے بعد مصطفیٰ آباد (رام پور) کے اہل کمال لوگوں کی تعریف ہے۔ پھر ایک فرضی شخص سے خطاب ہے جو درباری رئیسوں اور سرکاری مہمانوں کے خیمے دیکھ کر واپس آرہا ہے :—

تو اے کز کس سیر ہنگاہ سران ہند می آئی چہ آوردی بگو از جنس معنی ارمغاں مارا

گرفتم دیدۂ از ملک دولت بہرہ ور جمعے ولے کم دیدہ باشی علم و دولت را بہم یکجا

اور حقیقت بھی یہ ہے کہ مداح کو اپنا ممدوح ہی سب سے زیادہ پسند ہے کیوں کہ :—

بہ گلشن جلوۂ ہر نونہالے دیدنی دارد ولے در خاطر بلبل نہ گنجد جز گل رعنا

اور اس کا اصل سبب یہ ہے کہ :—

کسے کو باشد از پیرایۂ علم و ہنر عاری بچشم اہل دل ہیچ است اگر جمشید اگر دارا

اس کے بعد حالی صاف طور پر کہدیتے ہیں کہ یہ جتنے اوصاف بیان کیے ہیں وہ مال و دولت کے لالچ کے لیے نہیں ہیں :—

ولے با فرّ صورت، حسن معنی جمع چوں دیدم نیارستم زباں بستن ز شکر واہب یکتا

اس کے بعد کچھ اوصاف اور بیان کرکے دعائیہ پر آگئے ہیں اور دو تین شعر لکھ کر اس طرح قصیدہ ختم کردیا ہے :—

تکلف نیست در ہرچہ از دعا و از ثنا گفتم تو دانی حال ما یا عالماً بالجہر والاخفا

اس کے بعد حالی نے اور بھی کئی فارسی قصیدے لکھے لیکن وہ زیادہ اہم نہیں ہیں۔ سنہ ۱۳۰۶ ھ مطابق ۱۸۸۹ ع کی عیدالفطر کے موقع پر نواب سر آسماں جاہ کی تعریف میں جو قصیدہ ہے وہ صرف دعائیہ ہے۔ ابتدا یوں ہوتی ہے :—

صاحبا روز و شب بکام تو باد صبح نوروز و عید شام تو باد

اس کے بعد اسی سال عیدالضحیٰ کے موقع پر حیدرآباد میں اسی ممدوح کو ایک اور قصیدہ "پیش کرنا پڑا"، اس کا مطلع یہ ہے :—

عید اضحیٰ کہ قریں باد ورودش بہ ظفر باد بر خواجہ ز عید رمضاں فرخ تر

اس قصیدے میں صرف ۹ اشعار میں معمولی مدح ہے پھر اس شعر سے تملق اور چاپلوسی کا دروازہ ہی بند کردیا ہے۔

آں سر اوج کرامت کہ زوالا گہری بے نیاز آمدہ از مدح چو ماہ از زیور

هرچند اشعار میں مختلف لوگوں کی مدح سرائی کے طریقے بیان کیے ہیں اور آخر میں کہتے ہیں کہ :-

پس همان به که کند ختم سخن را بدعا که دم عجز پناهد به دعا مدحت گر

پھر اس طرح سے دو تین شعر کے بعد یہ قصیدہ ختم کردیا ہے۔ لیکن ایک قصیدہ ضرور اپنی تاریخیت کے اعتبار سے اہم ہے اور وہ امیر حبیب‌الله خان والی افغانستان کی مدح میں ہے جب کہ وہ ۱۹۰٦ع میں علی‌گڑھ تشریف لائے تھے۔ وہ اس طرح شروع ہوتا ہے :-

می رسد گر فرق عزت بگذرد از فرقدان میزبانے را که شاہے چون تو باشد میهمان

گربه‌رقص آید در و دیوار کالج دور نیست زین طرب کامد به دیدارش امیر کاروان

دولت بیدار مفت ما که شد مهمان ما چون تو مهمان عزیز قیصر هندوستان

اس وقت حالی کو سرسید مرحوم (المتوفی ۱۸۹۸ع) کی یاد آتی ہے :-

زنده کاش امروز بودے بانی این درس گاه تا بدیدے پایه اش بالا تر از وهم و گمان

تا همه امید ها کاندر دل خود بسته بود از قدوم شه بچشم خویشتن دیدے عیان

اس قصیدے میں حالی نے اصل مدح بالکل نہیں لکھی۔ بلکہ ممدوح سے خطاب کرکے ۴-۵ شعر میں کالج کے قیام اور اس کی مخالفت وغیرہ کا حال بیان کردیا ہے اور شکریہ ادا کرنے کے متعلق لکھا ہے کہ :-

گر نویسد پارهٔ زان، نیست یارائے قلم ور بگوید اندکے زان نیست نیروے زبان

پس همان بهتر که گردد بردعا ختم سخن زان که ناید جز دعاے خواجه از ما بندگان

اس کے بعد دعائیہ لکھ کر قصیدے کو ختم کردیا ہے۔ ان قصیدوں کے علاوہ حالی کے دو مرثیے بھی ہیں۔ ایک مرثیہ، سر سالار جنگ میر تراب علی خان (مدارالمہام سرکار عالی نظام) کی وفات پر ہے۔ وہ ترجیع بند میں ہے اور اس میں دو دو شعر کے ۹ بند ہیں۔ ترجیعی بیت یہ ہے۔

اے اجل گر تن بیجان نه خاکش سپری نتوانی که نکو نامیش از یاد بری

یہ ترجیع بند، سرسالار جنگ کی قومی خدمات کی وجہ سے لکھا گیا تھا۔ لیکن قومی خدمات اور دل کے صحیح جذبات کی بنا پر در اصل سرسید کا مرثیہ لکھا تھا جو محتشم کاشی کے انداز میں ہے۔ اور غالب کے مرثیے میں جس طرح حالی روئے تھے اس سے زیادہ سرسید کے مرثیے

میں وہ روتے بسورتے نظر آتے ہیں ۔ غالب کی موت ، ادب کی موت تھی لیکن سرسید کی موت نہ صرف ادب کی بلکہ تمدن و ثقافت ، تعلیم و تہذیب اور ازمنۂ ثلاثہ کے اوصاف کی موت تھی۔ اس مرثیے میں حالی اتنے روئے کہ پھر بقیہ زندگی میں عیش و نشاط کے موقعوں پر بھی انھیں ہنسی نہ آئی ۔ چنانچہ ہم اوپر دیکھ چکے ہیں کہ امیر حبیب اللہ خاں جیسی ہستی کی تشریف آوری پر اور دوسرے موقعوں پر قصیدے بھی لکھے ہیں تو ان میں تعریف اور مدح کے اشعار ہی برائے نام ہیں اور انھیں کسی کے اوصاف ، سرسید جیسے محسن قوم کے اوصاف کے مقابلے میں پسند ہی نہ آتے تھے ۔ سرسید کی وفات ۱۳۱۵ ھ مطابق ۱۸۹۸ع پر محتشم کاشی کی طرح حالی نے بھی سات بند " ترکیب بند " میں لکھے اور ہربند میں نو شعر کہے ۔ پہلا بند اس طرح شروع ہوتا ہے :-

آہ ازیں تیر گذارا کز کماں انداختند		آہ کز یک زخم قومے نیم جاں انداختند
ای عجب کز رحلت فردے ز افراد بشر		عالمے را از قیامت در گماں انداختند
ای عجب کز مردن یک پیر مرد سالخورد		تاب و تپ در کودک و پیرو جواں انداختند
ای عجب کز سوز اندوہ وفات مسلمے		مردم ہر کیش را آتش بجاں انداختند
سید اندر قوم نقدے بود اندر کیسۂ		کیسہ خالی ماندہ و نقد از میاں انداختند
قوم را سرمایۂ مجد و علا از دست رفت		بعد ازاں کایں گنج را در خاکداں انداختند
نو بہار آید دگر در باغ قوم، امید نیست		بعد ازو طرح خزان جاوداں انداختند
تا قیامت گوئی از تاراج ما فارغ شدند		کایں مصیبت بر سر اسلامیاں انداختند
اہل دیں بے یاورو دیں بیکس و بے یار ماند		ہر کہ ایں آوازہ در ہندوستاں انداختند

رفت و با خود رونق بزم مسلمانی ببرد
ملت از مرگش بپژمردہ مسلمانی بمرد

یہ ترکیب بند بہت طویل ہے اس لیے اس کے جستہ جستہ چند اشعار سنیے اور حالی کے واردات قلبی کا اندازہ لگائیے ۔ تیسرے بند کے آخر میں کس قدر صحیح فرماتے ہیں :-

زیستن در فکر قوم و مردن اندر بند قوم		گر توانی بے توانی سید احمد خاں شدن
می تواں مقبول عالم گشت اما ہمچو شیخ		بہر سود خلق مردود جہاں نتواں شدن
جور اخواں دیدن و درعشق اخواں زیستن		زخم پیکاں خوردن و مشتاق پیکاں زیستن

آخری شعر تو غضب کا ہے اور حقیقت ہے کہ اس طرز کے اشعار اپنی مثال آپ ہیں اور حقیقی اوصاف کے صحیح ترجمان ہیں۔ پانچواں بند ادبیت کے لحاظ سے بہت اہم ہے۔ اس میں تشبیہات و استعارات کے بڑی لطیف نمونے ملتے ہیں اور بے ساختگی، برجستگی اور روانی کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہے۔ چند شعر ملاحظہ ہوں :-

گوے از گردش فرو ماندست چوگاں راچہ شد
کشتی از جا می نہ جنبد موج عماں را چہ شد

دہ بہ ویرانی نشد، وقت ست، دہقانش کجاست
کہ سر گرداں شود، زودست، چوپاں را چہ شد

چیرہ شد سہراب دوراں، رستم دوراں کجاست
یافت فرصت اہرمن۔ مہر سلیماں را چہ شد

تارک ہر کس ندارد تاب گرز روزگار
بر نمی تابد سرے این پتک، سنداں را چہ شد

قوم را ہم عتاب و چشم رحم از کس نماند
آں لب نفریں سرا، آں چشم گریاں را چہ شد

ان کے علاوہ دوسرے اشعار میں سر سید کے احسانات کا اجمالاً ذکر ہے اور ان تمام واقعات کی طرف اشارہ ہے جو سر سید کی زندگی میں خصوصیت کے ساتھ پیش آئے اور انہوں نے ان کا مقابلہ کیا۔ آخر میں قوم کو خطاب کر کے حالی بڑی اچھی نصیحت کرتے ہیں کہ :-

مزد او این بس کہ در اصلاح خود کوشید زود
کز شما غیر از شما مطلوب او چیزے نہ بود

آخری مصرع میں سر سید کی تمام خدمات کا ایک اور صرف ایک مقصد بیان کیا ہے یعنی قوم سے صرف قوم ہی انہیں مطلوب تھی اور وہ اسی کے لیے جیے اور اسی کے لیے فدا ہوگئے، چناں چہ ایسے محسن قوم اور ایسے فدائے ملک کے غم میں حالی کا مرثیہ حقیقی ماتم تھا اور اس کے بعد گو کہ انہوں نے فارسی میں متعدد قطعات، رباعیات اور قصائد وغیرہ بھی لکھے لیکن ایسی تمام شاعری سے اس سوگوار قوم نے انکار کرکے یوں لکھ دیا کہ "میری سب سے اخیر فارسی نظم وہ ترکیب بند ہے جو سر سید کی وفات پر میں نے سنہ ۹۸ع میں لکھا تھا"۔ آہ ہم حالی جیسے محسن قوم و ادب کو بھی آج فراموش کرچکے ہیں۔ انہوں نے سچ کہا تھا کہ :- قدر حالی ز قوم کس نہ شناخت عاقبت رفت از میانۂ ما

***

حالی کا تصور اسلوب

از

ڈاکٹر سید عبداللہ صدر شعبۂ اردو پنجاب یونیورسٹی

مولانا حالی نے اسلوب کا کوئی منظم اور مربوط نظریہ پیش نہیں کیا مگر اس امر سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ ان کی تصانیف میں اسلوب کی ماہیت اور اس کے عناصر ترکیبی کے متعلق بکھرے ہوئے خیالات اور تصورات موجود ہیں جن میں نظم پیدا کردینے سے ان کے تصور اسلوب کا سرسری سا خاکہ تیار ہوجاتا ہے۔ اس سلسلے میں ان کی عملی تنقید کے علاوہ مقدمہ شعر و شاعری کی متفرق بحثیں بھی ہمیں بہت مدد دیتی ہیں۔

یہ مسلم ہے کہ مولانا حالی نے اصول تنقید کے متعلق مغرب سے آئے ہوئے خیالات سے استفادہ کیا ہے، چنانچہ مقدمۂ شعر و شاعری کے علاوہ عملی تنقیدوں میں بھی وہ مغرب کے ان نظریات سے فائدہ اٹھاتے ہیں۔ اسلوب کی ماہیت کے فہم و ادراک کے سلسلے میں بھی وہ مغربی تصورات سے یقیناً متاثر ہوئے چنانچہ آگے چل کر لفظ و معنی کی بحث سے بخوبی ثابت ہوجائے گا۔

اس سلسلے میں یہ حقیقت ضرور پیش نظر رہنی چاہئے کہ حالی کا مغرب سے استفادہ بالواسطہ تھا۔ انہیں مغربی اصولوں کے مطالعہ کا براہ راست موقعہ نہیں ملا۔ ان کی واقفیت اس معاملے میں ادھوری تھی، یہی وجہ ہے کہ ان کے مباحث میں بعض اوقات ایک طرح کی بے یقینی اور تذبذب بلکہ تضاد پایا جاتا ہے اور ہر چند کہ ان کے بیانات میں مغربی خیالات کی جھلک دکھائی دیتی ہے مگر عموماً قدیم تصور ہی ان کے فکر و نظر کا محور ہے۔

حالی کی رائے میں اسلوب اصولاً مصنف کی فطرت اور طبعیت کے "نیچرل" بہاؤ کا نام ہے۔ وہ ادیب اور اس کے اسلوب بیان کے درمیان اتنا فاصلہ تسلیم نہیں کرتے جتنا قدیم علمائے

بیان و بلاغت سمجھتے تھے ، ان کا خیال یہ ہے کہ ادیب پہلے پیدا ہوتا ہے پھر بنتا ہے - جو ادیب پیدا نہیں ہوتے وہ بن ہی نہیں سکتے -

عجیب بات یہ ہے کہ مولانا حالی اپنے اس نظریے پر تادیر قائم نہیں رہتے ، اصولاً انشا اور اسلوب کو طبیعت کا قدرتی بہاؤ قرار دینے کے بعد اس کی تکمیل کے سلسلے میں اس کے میکانکی عمل اور مشق اور مزاولت کو ضرورت سے زیادہ اہمیت دیتے ہیں - وہ زبان کی مہارت اور تنقیح و تہذیب کو بھی انشا کے اصولی عناصر میں شامل سمجھتے ہیں - اس سے بڑی عجیب تر بات یہ ہے کہ طبیعت سے ان کی مراد ادیب کی پختہ جذباتی کیفیت نہیں بلکہ وہ کسی حد تک رجحانات اور عادات کو طبیعت کا مرادف سمجھتے ہیں -

مولانا حالی کے اس تذبذب کا ثبوت یہ ہے کہ وہ اسلوب کی ماہیت کی صراحت کے لیے جو تشبیہیں اور تمثیلیں پیش کرتے ہیں وہ بہت حد تک مشتبہ ہوتی ہیں - انھوں نے ایک موقع پر اسلوب کو بھوت سے تشبیہ دی ہے جو ہر ادیب پر سوار ہوتا ہے (۱) - ایک لحاظ سے یہ تشبیہ (یا استعارہ) نہایت دلچسپ اور پر لطف ہے کہ ہر ادیب کا " اسلوب " اس پر اس طرح قابض اور متصرف ہوجاتا ہے جس طرح دیوانگی کسی مجذوب یا دیوانے پر سوار ہوجاتی ہے اس سے اسلوب کا ناگزیر ہونا ثابت ہوتا ہے ، مگر مولانا حالی کی باقی تحریروں سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ یہ بھوت دراصل کوئی داخلی چیز نہیں جو اندرونی نفسی عوامل و بواعث سے سوار ہوتا ہے ، بالکل خارج سے آکر مصنف کے ذہن و فکر پر قابض ہوجاتا ہے - اس اعتبار سے ان کے اس محاورے نے (جس کے دلچسپ ہونے میں کلام نہیں) داخلیت کی بجائے خارجیت اور " لاحقیت " کا راستہ صاف کیا ہے -

انھوں نے ایک دوسرے موقع پر اسلوب کے لیے " رنگ چڑھ جانے " (۲) کا محاورہ استعمال کیا ہے - اس سے صاف صاف معلوم ہوتا ہے کہ وہ اسلوب کے داخلی رنگ کی بجائے مشق و مزاولت سے پیدا شدہ رنگ کی اہمیت پر کچھ زیادہ زور دیتے ہیں -

---

(۱) حیات جاوید ج ۲ ، صفحہ ۲۹۳ " (جس مصنف یا مضمون نگار کو دیکھیے اس پر کوئی نہ کوئی بھوت سوار ہوتا ہے) " -

(۲) " ہر مصنف پر اس کی طبیعت کے میلان کے موافق رفتہ رفتہ کسی خاص پیرایۂ بیان کا رنگ چڑھ جاتا ہے " (حیات جاوید ج ۲ صفحہ ۲۹۳) -

مولانا حالی نے اسلوب کی جذباتی بنیادوں کا اعتراف کئی موقعوں پر کیا ہے۔ اور اگرچہ انہوں نے جذبے کو اسلوب کا ہیولیٰ قرار نہیں دیا تاہم اس کا "رنگ" ضرور تسلیم کیا ہے۔ یہاں پہنچ کر مولانا حالی کسی حد تک علمائے بلاغت سے الگ نظر آتے ہیں جن کا نظریہ یہ ہے کہ اچھی انشا محض تخیل سے (یعنی خیال گھوڑنے سے) بھی پیدا کی جاسکتی ہے، اس کے لیے جذبے کی ضرورت نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ابوالفضل کی اس تحریر کو جس کا اظہار ان کے درباری خطوط و مکاتیب میں ہوا ہے، اس نثر پر ترجیح دی جاتی رہی ہے جو ان کی انشا کے تیسرے دفتر میں پائی جاتی ہے۔ مولانا حالی نے ہر موقعہ پر اس خیال کی تردید کی ہے اور جذبے کی سچائی اور صداقت پر بڑا اصرار کیا ہے۔

مگر اس کے باوجود وہ ایک "حسین تحریر" اور "مؤثر تحریر" کے درمیان خط فاصل کھینچتے ہیں۔ ان کی رائے یہ معلوم ہوتی ہے کہ تحریر میں اثر کے لیے راست بازی اور خلوص کی بہر حال ضرورت ہے، مگر یہ ضروری نہیں کہ یہ "اثر" اور "حسن" دونوں دوش بدوش موجود ہوں۔ ان کے نزدیک ایک تحریر مؤثر ہوسکتی ہے مگر ضروری نہیں کہ حسین بھی ہو۔ اثر اور حسن کو دو الگ الگ صفات قرار دینے سے مراد یہ ہوئی کہ حسن کی تخلیق جذبے کی محتاج نہیں، گویا حسن‌کاری ایک معمار یا بڑھئی کا عمل ہے جس میں اختراعی عمل بہت حد تک فکری، نوعیت کا ہوتا ہے۔

شاید یہی وجہ ہے کہ مولانا حالی نے ایک موقعہ پر شاعر کے عمل کو معمار کے عمل سے تشبیہہ دی ہے اور تخلیقی سلسلے کو عمارت کے نقشے سے مشابہت دے کر شاعرانہ تجربے کی نوعیت کے متعلق غلط فہمی پیدا کردی ہے۔ اسی طرح سر سید کے اسلوب کی بحث میں ادیب کے کام کو "سپاہی (۱) کے کرتبی ہاتھ" سے اور سعدی کے طرز بیان کے سلسلے میں اس کو

(۱) مولانا حالی کی یہ تمثیل عجیب و غریب اور مغالطہ انگیز ہے "جس طرح تلوار کا کاٹ در حقیقت اس کے باڑھ میں نہیں بلکہ سپاہی کے کرتبی ہاتھ میں ہے اسی طرح کلام کی تاثیر اس کے الفاظ میں نہیں بلکہ متکلم کی سچائی اور اس کے نڈر دل اور بے لاگ زبان میں ہے" (حیات جاوید، ج ۲، ص ۲۰۹) عبارت کے دوسرے حصہ میں جو اصول بیان ہوا ہے وہ غلط نہیں مگر تلوار کی کاٹ اس کے باڑھ میں ہے کرتبی ہاتھ اس کا استعمال جانتا ہے۔ کاٹ بہر حال باڑھ میں ہے۔

کاتبوں کی مشق سے مماثل قرار دیا ہے۔ غرض اس میں کچھ شک نہیں کہ مولانا حالی نے جذبے کی اہمیت کو تسلیم کرتے ہوئے بھی اسلوب میں اس کے گہرے اور ہمہ گیر اثرات پر زور نہیں دیا۔

کسی زندہ اسلوب کے لیے جذبے کے خلوص اور صداقت کی ضرورت مسلم ہے، مولانا حالی بھی اس ضرورت کے معترف ہیں، مگر وہ عموماً جذبے کی بنیادی اہمیت کو بعض مشتبہ بیانات کی وجہ سے مشکوک بنا دیتے ہیں۔ مثلاً ان کی یہ رائے ہے کہ :-

"جو لوگ تصنیف کے درد سے آگاہ ہیں وہ جانتے ہیں کہ کلام میں لذت اور مقبولیت پیدا نہیں ہوسکتی جب تک اس کے ایک ایک لفظ میں مصنف کے خون جگر کی چاشنی نہ ہو" (حیات سعدی ص ۳۷)

اس عبارت میں خون جگر سے مراد درد، احساس اور فیلنگ ہونا چاہیے، مگر عبارتوں کے سیاق و سباق سے یہ محسوس ہوتا ہے کہ تصنیف کے درد اور مصنف کے خون جگر کی چاشنی سے مراد وہ محنت و مشقت ہے جو تصنیف کی تکمیل کے لیے مصنف کو اٹھانی پڑتی ہے، مثلاً مواد جمع کرنا، پھر اس کو مرتب کرنا اور پھر تنقیح و تہذیب کے بعد منظر شہود پر لانا وغیرہ وغیرہ۔ ان سب باتوں کے لیے مصنف کو خون جگر کھانا پڑتا ہے اس کے بعد جا کر وہ تصنیف کو مکمل کرتا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ سب کچھ مصنف کے کام کا خارجی حصہ ہے، اس میں اس کے کام کا داخلی حصہ شامل نہیں۔

شاعری اور ادب کے متعلق مولانا حالی کا ذہن قدیم بلاغت کے تصورات سے اس قدر متاثر ہے کہ ظاہری فکری تبدیلی کے باوجود وہ غیر شعوری طور پر ادھر جھک ہی جاتے ہیں، چنانچہ بیان اور انشا کو داخلی سے زیادہ خارجی اور محض صناعتی چیز سمجھنے کے معاملے میں وہ ہمیشہ جدید خیال کے مقابلے میں قدیم خیال کی طرف میلان ظاہر کرتے ہیں۔ شاعروں کو باورچیوں سے مشابہت دینا، بیان کو مکان کے نقشے سے مماثل قرار دینا اور سپاہی کے کرتبی ہاتھ کو تلوار کے جوہر پر ترجیح دینا۔ یہ سب اسی میلان کے اثرات ہیں۔ اس خیال کی تقویت اس بات سے بھی ہوتی ہے کہ وہ ادیب کے کام کی نوعیت کے متعلق بڑی الجھن میں مبتلا ہیں۔ چنانچہ حیات جاوید میں ریفارمر (مصلح) اور انشا پرداز کے تخلیقی عمل سے بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں :-

''یہ خاصیت جس کو ہم نے بیان کیا ہے ایک سچے رفارمر کے کلام میں ایسی ہی ضروری ہے جیسی سچائی اور راستبازی ، وہ مثل شاعروں اور انشاپردازوں کے اپنے کلام کی بنیاد الفاظ کی شستگی اور ترکیبوں کی برجستگی پر نہیں رکھتا بلکہ اس بے قرار آدمی کی طرح جو گھر میں آگ لگی ہوئی دیکھ کر ہمسایوں کو بے تابانہ آگ بجھانے کے لیے پکارتا ہے - ایسے الفاظ استعمال کرتا ہے جو گھبراہٹ کی حالت میں بے ساختہ انسان کے منہ سے نکل جاتے ہیں - وہ واقعات پر تشبیہہ واستعارہ کے پردے نہیں ڈالتا، بلکہ ان کی تصویر کھلم کھلا سب پر ظاہر کرتا ہے - وہ الفاظ و قواعد کا محکوم نہیں ہوتا بلکہ الفاظ و قواعد کو اپنے جذبات کا محکوم رکھتا ہے -'' (حیات جاوید ، ج ۲ صفحہ ۳۸۹ - ۳۹۰)

گویا مولانا حالی کا خیال یہ ہے کہ شاعر اور انشاپرداز(رفارمر کے برعکس) اپنے کلام کی بنیاد محض الفاظ کی شستگی اور لفظوں کی برجستگی پر رکھتے ہیں اور '' فیلنگ '' اور احساس کی اس شدت اور بے تابی سے محروم ہوتے ہیں، جو بقول حالی صرف رفارمر کے حصے میں آتی ہے- مگر ان کی یہ رائے کسی طرح درست تسلیم نہیں کی جاسکتی - کیونکہ شاعر اور ادیب دونوں اپنے تخلیقی عمل میں جذباتی تجربے کے اسی طرح محکوم اور پابند ہیں جس طرح ایک مخلص رفارمر ، ہر چند کہ دونوں کا نصب العین اور طریق کار بعض جزئیات میں مختلف ہوتا ہے -

اس بحث میں مولانا حالی نے جس تشبیہہ سے کام لیا ہے وہ ان کی عام تشبیہوں کی طرح مغالطہ انگیز ہے- اس سے ان کی اصل بحث میں بڑی الجھنیں پیدا ہوگئی ہیں- اگر ہم اس تشبیہہ کو درست مان لیں تو ہمیں تسلیم کرنا پڑے گا کہ ایک رفارمر جذبے کی شدت سے اس درجہ مغلوب ہوتا ہے کہ وہ ایک ایسے آدمی کی طرح جس کے گھر میں آگ لگی ہو ہمسایوں کو اتنی بے تابی سے آگ بجھانے کے لیے پکارتا ہے کہ اسے الفاظ کی سدھ بدھ نہیں رہتی- مگر سوال یہ ہے کہ ایک رفارمر واقعی اس درجہ '' مغلوب الجذبات '' ہوجاتا ہے کہ اسے شدت جذبہ کے زیر اثر ہمسایوں کو پکارنے کے لیے مناسب الفاظ بھی میسر نہیں آتے ، چنانچہ وہ شاعروں کے برعکس الفاظ کے موزوں اور غیر موزوں ہونے کی پروا نہیں کرتا اور لوگوں کو (جس طرح بھی بن آئے) لفظوں اشاروں اور علامتوں کے ذریعے آگ کی طرف متوجہ کرتا ہے-

اس تمثیل کو صحیح تسلیم کرنے کا لازمی نتیجہ یہ بھی ہوگا کہ ہم شاعر اور ادیب کو ایک ایسی مخلوق قرار دیں گے جو یا تو گھر کی آگ ، کو دیکھ کر ٹس سے مس نہیں ہوتا، یا پھر وہ ایسا بےفکرا انسان ہے جو اس کرب و بلا کی حالت میں بھی بڑے مزے سے الفاظ و تراکیب کے قماش تیار کرتا رہتا ہے۔ گھر میں آگ لگی ہے اور وہ لفظوں کی تراش خراش میں منہمک ہے ۔ حقیقت یہ ہے کہ ہم شاعر اور انشا پرداز کے متعلق مولانا حالی کی اس رائے کو قبول کرنے کے لیے تیار نہیں ۔

ایک ریفارمر —— بشرطیکہ وہ مخلص ہے —— جذبے کی اس شدت کا شکار ہوسکتا ہے مگر چونکہ اسے اپنے پیغام کی صداقت کا وجدانی طور پر یقین ہوتا ہے اس لیے عموماً اس پر اضطرار اور بے قراری کی یہ حالت طاری نہیں ہونی چاہئے ۔ ادیب اور شاعر کے برعکس ریفارمر کے لیے اصولاً کسی مخاطب کا ہونا ضروری ہے، اس لیے یہ ضروری ہے کہ وہ ابلاغ و تبلیغ کے دوران میں اپنے مخاطبوں کے مزاج اور ان کی طبیعت کا خاص خیال رکھے ۔ یہی وجہ ہے کہ عموماً ریفارمر اپنے مخاطبوں سے ''کلموالناس علی قدر عقولهم'' کے مطابق گفتگو کرتے ہیں۔ اس اعتبار سے اگر غور کیا جائے تو ریفارمر شاید شاعر و ادیب سے کہیں زیادہ الفاظ اور زبان کے انتخاب میں مخاطب کے مزاج کی پاسداری پر مجبور ہے۔ شاعر اپنے جذبے کا اظہار کرتا ہے ۔ کس نشنود یا بشنود من ہائے و ہوئے می کنم —— مگر ریفارمر کے لیے سننے والوں کے وجود کو تسلیم کرنا ضروری ہے، ورنہ یک طرفہ ہونے کی وجہ سے تلقین وتذکیر کا وجود ہی بے مقصود ہوجاتا ہے ۔

یہ درست ہے کہ ریفارمر ، شاعر اور انشا پرداز تینوں اپنے اپنے جذبات کا اظہار کرتے ہیں اور تجربے کی شدت سے ان کے اظہار میں '' فوری پن '' (Immediacy) کی حالت کا پیدا ہوجانا ممکن ہے، مگر یہ فوری پن اتنا شدید نہیں ہوسکتا جتنا مولانا حالی نے ظاہر فرمایا ہے ۔ مصلح ، شاعر اور انشا پرداز ۔ ان تینوں میں سے تیز '' فوری پن '' کی حالت ایک شاعر کے حصے میں آسکتی ہے نہ کہ ریفارمر کے حصے میں ۔

[زیر بحث تمثیل کے بقیہ حصوں کے متعلق بھی اسی قسم کے اعتراضات پیدا ہوتے ہیں جن کی تفصیل اپنے موقع پر آئے گی]

گذشتہ سطور میں جو کچھ بیان ہوا ہے اس سے یہ بات اچھی طرح ظاہر ہوجاتی ہے کہ مولانا حالی (دوسرے موقعوں پر ظاہر کیے ہوئے خیالات کے برعکس) ادیب اور انشاپرداز کو عملاً ایک صناع اور معمار کا درجہ دیتے ہیں۔ اس سے یہ گمان گزرتا ہے کہ اس موقع پر انہوں نے جس انشا پردازی اور ادب کا تذکرہ کیا ہے اس سے مراد وہ شاعری اور انشا ہوگی جس کی بنیاد لفظی صنعت گری پر ہوتی ہے۔ یہ وہ شاعری اور انشا پردازی ہے جس کی اہمیت کاریگری (Craft) سے زیادہ کچھ نہیں ہوتی۔ لیکن ان کی محولہ بالا عبارت میں اس کی کوئی تصریح موجود نہیں۔

گذشتہ سطور میں جو کچھ بیان ہوا ہے اس کے باوجود نظری طور پر حالی طبیعت (مصنف کی نیچر) کو اسلوب کا سرچشمہ قرار دیتے ہیں۔ ان کی تصانیف میں ”نیچرل اسلوب“ کی بحث نہایت دلچسپ ہے۔ اس دور کے بعض دوسرے مصنفوں کی طرح ”نیچر“ اور ”نیچرل“ ان کے پسندیدہ ترین الفاظ ہیں۔ وہ ”نیچر“ کی تحسین کے معاملے میں سر سید احمد خان سے کسی طرح کم نہیں جنہوں نے ’نیچر‘ کا سبق مغرب کے استادوں سے حاصل کیا تھا اور قوم کی بارگاہ سے ’نیچری‘ کا خطاب پایا تھا۔ سر سید احمد خان کے سب رفقا نے فطرت اور نیچر کے مضمون سے فائدہ اٹھایا ہے۔ شبلی، نذیر احمد، چراغ علی سب اپنے اپنے رنگ میں نیچر کے دلدادہ معلوم ہوتے ہیں۔ حالی بھی اسی جماعت کے ایک فرد ہیں۔

مولانا حالی کے ہاں ’نیچر‘ کا مفہوم متعین نہیں۔ خود یورپ میں اس کا مفہوم متعین نہ ہوا تھا۔ (Basil willey) کے (بقول (۱) اس کے کم و بیش ساٹھ ستر مفہوم پائے جاتے ہیں، بلکہ مغربی ادب میں اس کے حدود کی اس حد تک توسیع ہوگئی تھی کہ انہی کے الفاظ میں:—

'Nature is the grand alternative of all that man had made of Man'

گویا نیچر انسان اور کائنات کے تمام مسائل و معاملات کا مرادف لفظ بن گیا تھا۔

”نیچر“ اور اسلوب کے نیچرل ہونے سے مولانا حالی کی کیا مراد ہے۔ اس کے متعلق ان کے بیانات میں خاص رنگا رنگی ہے۔ چنانچہ ان کے نزدیک نیچر فطرت کا خارجی روپ بھی ہے اور انسان کی داخلی طبیعت بھی، نیچر سے مراد وہ پراسرار نظام بھی ہے جس کے قوانین داخلی طور

---

(۱) The Eighteenth Century Background-by Basil Willey.

ہر نظم کائنات کے مدار ہیں - اور وہ بھی جس کے اصول و مبانی عقل انسانی کی کسوٹی پر پرکھے جاسکتے ہیں -

اسلوب بیانی کے ضمن میں لفظ ' نیچرل ' کا استعمال ، حالی کی تصانیف میں کئی معنوں میں ہوا ہے۔ بہ حیثیت مجموعی ان کے نزدیک نیچرل بیان اور نیچرل مضمون دو الگ الگ اکائیاں ہیں۔ ان کے خیال میں ان دونوں کا اجتماع ممکن ہے ، مگر یہ بھی ممکن ہے کہ ایک تحریر ایسی بھی ہو جس میں مضامین نیچرل ہو مگر مضامین نیچرل نہ ہوں۔ واضح رہے کہ مولانا حالی عموماً مضمون اور طرز بیان کو ایک دوسرے سے منقطع دیکھنے کے عادی ہیں۔ اس وجہ سے ' نیچرل ' کے معاملے میں بھی وہ مضمون اور طرز بیان کا الگ الگ تصور کرتے ہیں۔

نیچرل مضمون سے مولانا حالی کا مقصود ایسے مضامین ہیں جو اولاً انسانی نیچر کے مطابق ہوں، ثانیاً قانون قدرت کے مطابق ہوں، ثالثاً عقل انسانی کے حد ادراک میں ہوں۔ نیچرل بیان سے ان کی مراد وہ بیان ہے جو عام فہم اور سادہ ہو۔ جو بے ساختہ طور پر طبیعت یا نیچر سے صادر ہوا ہو اور طبیعت کے قدرتی بہاؤ کے مطابق ہو اور ایسی زبان میں ہو جو اجتماع انسانی کے اس حصے کے لیے (جس میں وہ زبان بولی جاتی ہے) نیچرل ہو، یعنی ان کی عام بول چال کے مطابق ہو۔ گذشتہ مباحث کی روشنی میں یہ امر باعث تعجب نہیں کہ مولانا حالی نے نیچرل مضمون میں ایسے مضامین کو شامل نہیں کیا جو کسی شاعر یا ادیب کی انفرادی جذباتی "نیچر" کی پیداوار ہوتے ہیں۔ یہ صحیح ہے کہ اس تعلق میں میلان طبیعت کا تذکرہ ضرور کرتے ہیں مگر عملی تجربے میں یہ میلان طبیعت " عادت کی سطح تک جا پہنچتا ہے۔ مقدمہ شعر و شاعری میں نیچرل شاعری کی تعریف کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ " نیچرل شاعری سے مراد وہ شاعری ہے جو لفظاً و معناً دونوں حیثیتوں سے نیچر یعنی فطرت اور عادت کے مطابق ہو" اس کے بعد اس کی مزید تشریح کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ "لفظاً نیچرل ہونے سے یہ مراد ہے کہ وہ زبان کی معمولی بول چال کے موافق ہو کیونکہ زبان بھی بولنے والوں کی نیچر اور سیکنڈ نیچر کا حکم رکھتی ہے" اور معناً نیچرل شاعری کا تقاضا یہ ہے کہ اس میں " ایسی باتیں بیان ہوں جو دنیا میں ہوا کرتی ہیں یا ہونی چاہئیں "۔

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا وہ شاعری جس کی زبان معمولی بول چال کے موافق نہیں نیچرل شاعری میں شامل نہیں ؟ مولانا حالی کی تعریف کی رو سے ایسی شاعری کو یقیناً

نیچرل نہیں کہنا چاہیے ۔ جس کی زبان عام بول چال کے موافق نہ ہو ، اس اعتبار سے مرزا غالب اور اقبال کی شاعری کا بیشتر حصہ نیچرل کی حدود سے خارج ہوجاتا ہے۔ معناً مولانا حالی کے نزدیک نیچرل شاعری میں نہ صرف وہ باتیں ہونی چاہئیں جو دنیا میں ہوا کرتی ہیں بلکہ وہ بھی جو دنیا میں ہونی چاہئیں ۔ مگر مصیبت یہ ہے کہ '' ہونی چاہئیں،، کے دائرے کی وسعت اس قدر ہے کہ اس کی کسی طرح تحدید و تعیین نہیں ہوسکتی (۱) اس تعریف کو اگر درست تسلیم کرلیا جائے تو نیچرل شاعری نا قابل فہم حد تک وسیع ہوجاتی ہے ۔ ایک اور موقعہ پر مولانا حالی سعدی کے نیچرل بیان کی تصریح کرتے ہوئے اس کی حدود کو غالب کے اس شعر میں مقید کردیتے ہیں :

دیکھنا تقریر کی لذت کہ جو اس نے کہا
میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے

اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ مولانا حالی کے نزدیک نیچرل بیان وہ ہے جو اثر و تاثیر کے لحاظ سے ادیب اور قاری کے درمیانی بعد اور فاصلے کو قطعاً دور کردے ۔ نیچرل بیان کا یہ تصور جس میں ادیب کے تاثر کو مبدء اور قاری کے رد عمل کو منتہا قرار دے کر ان میں ایک یگانگت دکھائی گئی ہے، بہت حد تک حقیقت کے قریب ہے، مگر مولانا حالی ایک دوسرے مقام پر نیچرل بیان کو مبدء کی بجائے منتہا کے نقطۂ نظر سے دیکھنا شروع کردیتے ہیں، یعنی شاعر کے تجربے کی بجائے قاری کے تاثر کو اس کا معیار بنادیتے ہیں ۔ نہ صرف یہ بلکہ وہ اثر کو (مضمون اور تجربے کا نہیں) محض طرز بیان اور طریق ادا کا کرشمہ قرار دیتے ہیں ۔ حیات سعدی میں لکھا ہے :—

> '' نیچر کے بیان میں شیخ کا کلام واقعی لاثانی ہے ۔ خدا کی صنعت اور حکمت (یعنی نیچر) کے متعلق وہ وہی باتیں بیان کرتا ہے جو سب جانتے ہیں لیکن یہ کسی کی طاقت نہیں کہ ان کو ویسے پاکیزہ اور دلنشین بیان کے ساتھ ادا کرسکے،،۔

مولانا حالی کے اس بیان میں علامہ ابن خلدون کے اس خیال کی گونج صاف صاف سنائی دیتی ہے کہ معانی کی مثال پانی کی ہے اور الفاظ کی مثال پیالے کی ہے ۔

---

(۱) مثلاً ہونی چاہئیں،، سے یہ بھی مراد ہوسکتی ہے کہ اخلاقاً یا قانوناً ہونی چاہئیں ۔ یا میلان ' طبیعت ، کے مطابق ہونی چاہئیں یا انسانی معاشرہ کے تقاضوں کے ماتحت ہونی چاہئیں ۔ اس اعتبار سے مولانا کا بیان بہت مبہم ہوجاتا ہے ۔

ہر چند انہوں نے مقدمہ شعر و شاعری میں علامہ کی اس رائے سے بادب اختلاف کیا ہے، مگر نہ صرف اس معاملے میں بلکہ بہت سی اور باتوں میں بھی ان کا عمل ان کے نظرئے کا ساتھ نہیں دیتا۔

نیچرل بیان کے سلسلے میں مولانا حالی کے مختلف بیانات سے اگر مجموعی اثر لیا جائے تو یہ سمجھ میں آتا ہے کہ ان کے نزدیک نیچرل اسٹائل بے ساختگی اور سادگی کے مرادف ہے۔ سر سید کے اسلوب کے متعلق حیات جاوید میں لکھتے ہیں:

جس سادگی اور بے تکلفی کے ساتھ ابتدا میں مطلب نگاری شروع کی تھی . . . .
اسی سیدھے سادے اور نیچرل اسٹائل میں ہر قسم کی تحریر برابر لکھتے رہے،،
(ج ۱، ص ۹۰)

گویا ان کے نزدیک نیچرل اسٹائل سے مراد سادگی، بے تکلفی اور مطلب نگاری ہے۔ بیان کی یہ وہ صفت ہے جس پر مولانا حالی نے بار بار اصرار کیا ہے۔ حیات سعدی، حیات جاوید اور مقدمہ شعر و شاعری میں سادگی کی بحثوں کو پھیلا پھیلا کر بیان کیا ہے اور حق یہ ہے کہ لفظ ''نیچرل،، کی طرح سادگی اور بے تکلفی بھی ان کے تنقیدی نظام کے محبوب ترین الفاظ ہیں۔ ہم ان کے بیانات سے یہ نتیجہ نکال سکتے ہیں کہ مجموعی اعتبار سے ان کے نزدیک 'سادہ، اور 'نیچرل، دو ہم معنی اصطلاحیں ہیں۔

مولانا حالی کے نزدیک اس سادگی کا اصل سر چشمہ اور منبع طبع سلیم ہے چنانچہ آثار الصنادید کی بحث میں لکھتا ہے:-

''معلوم ہوتا ہے کہ گو کہ اس وقت طبع سلیم کے اقتضا سے خود سر سید کی تحریر سیدھی سادی تھی مگر سوسائٹی کے اثر سے یقیناً سادی عبارت لکھنے کو وہ حقارت کی نظر سے دیکھتے تھے . . . . مگر وہ بہت جلد متنبہ ہوئے چنانچہ دوسری مرتبہ اپنے سیدھے سادے نیچرل اسٹائل میں لکھ کر شائع کیا،، (حیات جاوید ج ۲، ص ۸۸)۔

اس اقتباس سے یہ ثابت ہوجاتا ہے کہ طبع سلیم سادگی کا خود تقاضا کرتی ہے۔ مگر انہوں نے سلامت طبع کی تشریح نہیں کی اس لیے یہ معلوم نہ ہوسکا کہ طبع سلیم کس چیز سے عبارت ہے۔ جبلت ہے؟ یا تربیت یافتہ مذاق ہے؟ یا فطری ذوق لطیف ہے جس کی نشو و نما

کا ذمہ دار ماحول ہے ، بظاہر طبع سلیم سے اُن کی مراد طبیعت کی صحت‌مند افتاد ہے جو ادیب اور مصنف کو خود بخود (۱) اچھے اسلوب اور طرز بیان کی طرف مائل کردیتی ہے اور اچھا اسلوب وہ ہے جس کی بنیاد سادگی پر رکھی گئی ہو۔

سادگی سے مولانا حالی کا مقصود کیا ہے ؟ یہ بحث مقدمہ شعر و شاعری میں بڑی مفصل ہے چنانچہ لکھتے ہیں :—

" سادگی ایک اضافی امر ہے . . . . ہمارے نزدیک کلام کی سادگی کا معیار یہ ہونا چاہیے کہ خیال کیسا ہی بلند اور دقیق ہو مگر پیچیدہ اور ناہموار نہ ہو اور الفاظ جہاں تک ممکن ہو تحاور اور روز مرہ کی بول چال کے قریب ہوں۔ جس قدر شعر کی ترکیب معمولی بول چال سے بعید ہوگی، اسی قدر سادگی کے زیور سے معطل سمجھی جائے گی "۔

اس عبارت میں مولانا حالی نے سادگی کو خیال اور بیان دونوں کا وصف قرار دیا ہے ، اگرچہ یہ ضرور محسوس ہوتا ہے کہ وہ یہاں بھی بیان اور خیال کو الگ الگ فردے (Unit) تصور کرتے ہیں اور سادگی کو بیان کا ایک ایسا وصف قرار دیتے ہیں جس کا حصول ادیب کا خارجی اور اختیاری فعل ہے، گویا وہ ایک بورڈ لکھنے والے کے رنگ کی طرح ہے جس پر لکھنے والے کے موقلم کو پورا تصرف اور اختیار ہے۔ یہ صحیح ہے کہ انہوں نے سلاست (خیالات) اور سادگی (بیان) کی پرانی تقسیم کو اختیار نہیں کیا ، مگر سادگی کو شاعر کے نفس کا بے ساختہ فعل قرار نہیں دیا اور نہ اس کو مصنف کے مخصوص تجربے کا مخصوص اظہار قرار دیا ہے۔

اس بات کا ثبوت کہ وہ سادگی کو بیان کا (نہ کہ خیال اور تجربے کا) ایک وصف مانتے ہیں اس بات سے بھی ملتا ہے کہ وہ اثر کو سادگی کا لازمی نتیجہ نہیں سمجھتے اور اعلان

---

(۱) اس کے لیے ایک اور لفظ بھی استعمال ہوا ہے " تحریر کی قدرتی قابلیت "۔ اس کی تشریح کے لیے بڑی عمدہ تمثیل دی ہے : " تحریر کی قدرتی قابلیت بغیر قصد و ارادہ کے قلم کو اس راہ پر ڈال دیتی ہے جس پر اس کو چلنا چاہیے، جس طرح پہاڑ کی رو رستے کے موڑ توڑ اور پیچ و خم کے ساتھ رخ بدلتی جاتی ہے اس طرح ہر مقام کے مقتضا کے موافق تحریر کا رنگ خود بخود بدل جاتا ہے " (حیات جاوید ج ۲ ، ۳۹۳)

کرتے ہیں کہ کلام میں اثر کے لیے ضروری ہے کہ " متکلم کا دل آزادی اور سچائی سے بھرا ہوا ہو " --- اس کا مطلب یہ ہوا کہ سادگی کلام کا ایک ایسا وصف ہے جو تجربے کے ساتھ اظہار کے سانچے میں متشکل ہونا شروع نہیں ہوتا بلکہ ایک الحاق اور ہے۔ متکلم کے دل کی آزادی اور سچائی سے کلام میں اثر خود بخود پیدا ہوجائے گا سادگی سے صرف قبول عام کا فائدہ حاصل ہوگا۔ ان کا ارشاد ہے:—

" کلام کے مؤثر ہونے کے لیے اس کا سادہ اور بے تکلف ہونا ضرور ہے مگر اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ جو کلام کیسا ہی سادہ اور بے تکلف ہو وہ مؤثر بھی ضرور ہوگا "۔

واقعہ یہ ہے کہ اثر اور سادگی دونوں کا سرچشمہ ادیب کا قماش نفسی اور تجربے کی نوعیت ہے۔ کلام میں سچی سادگی اور بے تکلفی کا وجود اثر کے ساتھ لازم و ملزوم ہے۔ اگر سادگی محض بیرونی صنعت ہے تو بے شک اثر اور سادگی کا الگ الگ رہنا ممکن ہے ورنہ دونوں کا ساتھ ساتھ چلنا لازمی ہے۔

اس سے پہلے یہ ذکر آچکا ہے کہ مولانا حالی کے نزدیک نیچرل اسلوب بہترین اسلوب ہے اور نیچرل اسلوب کم و بیش مرادف ہے سادگی، بے تکلفی اور مطلب نگاری کا۔ حیات جاوید کے بیانات سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ سر سید احمد خاں نیچرل اسلوب یا نیچرل اسٹائل کے مالک تھے، گویا دوسرے الفاظ میں ان کے کلام میں سادگی اور بے تکلفی (بے ساختگی) بدرجۂ اتم پائی جاتی ہے، مگر یہ امر تعجب سے خالی نہیں کہ حالی نے سید صاحب کے نیچرل اسلوب کی مدح و تعریف کرتے ہوئے سادگی اور بے ساختگی کی حدود بہت وسیع کردی ہیں۔ بلا شبہ سید صاحب کی بے تکلف مطلب نگاری بڑی تحسین کے لائق ہے۔ اسی طرح پرانے پر تکلف طریقے سے احتراز اور بے ساختہ اظہار ان کے طرز بیان کے فضائل میں شمار ہوسکتا ہے مگر قیامت تو یہ ہے کہ سید صاحب کی سادگی بعض اوقات بے رنگی تک پہنچ جاتی ہے۔ غالباً اسی کمزوری نے سید صاحب کے ادب کو کلاسیکی ادب کی عظمت سے محروم رکھا۔ کلاسیکی ادب کی شان یہ ہے کہ اس کی زبان زمانے کے شستہ اور تربیت یافتہ مذاق کی آئینہ دار ہو۔ سید صاحب کی تحریریں اس صفت سے خالی ہیں۔ کلاسیکی ادب کی شان حالی کی تحریروں میں یقیناً پائی جاتی ہے جن کی سادگی اور مطلب نگاری خوش گوار لطافتوں سے لبریز ہے مگر

سر سید کی تحریروں میں وہ ادبی لطافت موجود نہیں جس کا حسن و جمال ان کے ادب پاروں میں ادبی شان پیدا کرسکے ۔ ان کی تحریریں بہت سادہ ہیں۔ ان کی تحریروں کی سادگی کو درشت اور درخت سادگی کہا جاسکتا ہے۔

مولانا حالی نے اس درشت سادگی کی جس انداز میں تعریف کی ہے اس سے یہ غلط فہمی ہوتی ہے کہ سرسید کی سادگی حسن کا بہترین نمونہ ہے ۔ مولانا حالی نے سرسید کے بیان کی بے ساختگی اور بے تکلفی کو بھی اسی نقطۂ نظر سے دیکھا ہے ۔ وہ انشا پردازی کے قدیم تصور سے اس حد تک تو ضرور برات کا اظہار کرتے ہیں کہ اس کے بعض اسالیب محض صناعتی مشق کے اپنے مخصوص ہوتے ہیں۔ اس قسم کے اسالیب میں کسی جذباتی تجربے کی ضرورت نہیں ہوتی ۔ ان میں مضمون طرز بیان کا خادم اور غلام ہوتا ہے اور واقعیت اور صداقت کو داخل ہونے کی اجازت نہیں ہوتی ۔ مولانا حالی یہ بھی مانتے ہیں کہ بے تکلف اظہار سچائی اور اثر کا نقیب اور ندیم ہوتا ہے مگر سادگی کی طرح اس بحث میں بھی وہ ادیب اور شاعر کے تخلیقی عمل کے ارتقا اور اس کی رفتار کو نظر انداز کردیتے ہیں اور بے ساختگی اور بے تکلفی کے ظہور اور نشو و نما کو ادیب اور شاعر کے تجربہ و خیال سے الگ صفت تسلیم کرتے ہیں ۔ بے تکلفی ان کے نزدیک بیان کا رنگ ہے نہ کہ تجربہ و خیال کا ۔ ۔ ۔ کیونکہ ان کے تصور میں بیان الگ چیز ہے اور خیال اور تجربہ الگ چیز۔

مولانا حالی جس قدر بے ساختگی کو اہمیت دیتے ہیں اسی قدر بلکہ اس سے بدرجہا زیادہ اہمیت وہ تنقیح و تہذیب کو دیتے ہیں ۔ یہ واقعہ ہے کہ شاعر اور ادیب بعض اوقات اپنے ادب پارے کی اصلاح و ترمیم کا سلسلہ تا دیر جاری رکھتا ہے ۔ اس کے جواز اور وجود سے انکار نہیں کیا جاسکتا ۔ بڑے بڑے شاعروں اور مصنفوں کے مسودات اس بات کا ثبوت بہم پہنچاتے ہیں ، مگر اس کی نوعیت صرف اسی قدر ہے کہ ادیب تجربے کا اظہار کر چکنے کے بعد جب دوبارہ اس پر نظر ڈالتا ہے تو بعض اوقات ایسے احساس ہوتا ہے کہ تجربے کا اظہار مکمل نہیں ہوا ۔ اسی تاثر کے ماتحت وہ اصلاح و ترمیم کرتا رہتا ہے تا آن کہ اس کی تشفی ہوجاتی ہے۔ دراصل اس اصلاح و ترمیم کا سرچشمۂ تحریک بھی شاعر اور ادیب کا جذبہ اور تجربہ ہے جس کے مکمل نقوش اس کے لوح تاثر پر جمع ہوئے ہوتے ہیں اور اس وقت تک ادیب کو بے قرار رکھتے ہیں جس وقت تک ان کا پورا نقشا خارج میں قائم نہیں ہوجاتا ۔ ترمیم و تکمیل کا

یہ سلسلہ محض لفظی اور خارجی نہیں بلکہ معنوی اور داخلی بھی ہے۔ تکمیل لفظوں کی مطلوب نہیں ہوتی بلکہ ان معانی کی جو مصنف اور شاعر کے مخزن تاثر میں موجود ہوتے ہیں ۔ مولانا حالی کے بیانات سے اس امر کا ترشح ہوتا ہے کہ وہ اس کو بہت حد تک خارجی عمل سمجھتے ہیں۔ اس کے علاوہ وہ تہذیب و تنقیح کے سلسلے کو مبالغہ کی حدتک اہمیت دیتے ہیں اور یہ باورکراتے ہیں کہ ہر وہ بیان جس کو بار بار کاٹا گیاہو اور درست کیا گیا ہو لازماً اس بیان سے زیادہ " لذیذ " اور " مقبول " ہوگا جس پر اس قسم کی محنت صرف نہ کی گئی ہو۔ حیات سعدی میں ایک موقعہ پر لکھتے ہیں :—

" جو لوگ تصنیف کے درد سے آگاہ ہیں وہ جانتے ہیں کہ کلام میں لذت اور قبولیت پیدا نہیں ہوسکتی جب تک اس کے ایک ایک لفظ میں مصنف کے خون جگر کی چاشنی نہ ہو اور جس قدر اس میں زیادہ صفائی اور گھلاوٹ پائی جائے اسی قدر سمجھنا چاہیے کہ اس کی درستی اور کاٹ چھانٹ میں زیادہ دیر لگی ہوگی " (حیات سعدی صفحہ ۳۷)

اسی عقیدے کی بنا پر مولانا حالی کا یہ قیاس ہے کہ شیخ سعدی نے گلستاں کی تالیف میں خاصا عرصہ صرف کیا ہوگا اور اس کا ثبوت خود گلستاں کا دلکش اور حسین اسلوب ہے۔ حالی صاف صاف کہتے ہیں کہ " جو فقرے لوگوں کو نہایت پسند آتے ہیں اور حد سے زیادہ صاف ہوتے ہیں وہ کئی مرتبہ کٹ کر صاف ہوتے ہیں " ۔ یہ بیان بالعموم درست مان بھی لیا جائے تو اس کو لازماً اور علی الاطلاق درست نہیں مانا جاسکتا، کیونکہ ضروری نہیں کہ جس عبارت کو بار بار درست کیا جائے وہ لازماً زیادہ حسین یا مکمل بھی ہو۔ بعض شاعروں اور نثر نگاروں کے اولین اظہارات ترمیم شدہ صورتوں کے مقابلے میں زیادہ مؤثر اور کامیاب ثابت ہوے ہیں ، مولانا حالی ایک موقع پر اس بحث کو پھر چھیڑتے ہیں چنانچہ بوستاں پر تبصرہ کرتے ہوے لکھا ہے :—

" یہی سبب ہے کہ خوش نویس لوگ اگلے استادوں کی مشق کو ان کے قطعات سے زیادہ عزیز رکھتے ہیں۔ فردوسی اور مولانا روم نے اگرچہ اپنی مثنویوں میں بخلاف نظامی اور سعدی کے الفاظ کی تنقیح و تہذیب اور کاٹ چھانٹ نہیں کی مگر با وجود اس کے صدہا مقامات ان کے ایسی حسن و خوبی کے ساتھ ادا ہوے

ھیں کہ تکلف اور ساختگی کی حالت میں شاید ادا نہ ھوسکتے ،، (حیات سعدی صفحہ ۱۰۱)

یہ رائے یقیناً حقیقت کے قریب ھے اگرچہ مولانا حالی کی اکثر تمثیلوں کی طرح یہ تمثیل بھی ایک دوسرے مسئلے کے مطابق غلط فہمی پیدا کر رھی ھے، وہ مسئلہ یہ ھے کہ ھمارا بلند مرتبہ نقاد شعر اور ادب کو ایک بار پھر کاتبوں اور خوش نویسوں کی مشق سے تشبیہہ دیتا ھے حالانکہ ادب اور کتابت کی ماھیت جدا جدا ھے۔

جیسا کہ پہلے بیان ھوچکا ھے مولانا حالی، سر سید احمد خاں کے نیچرل اسلوب کے مداح ھیں۔ یہ ظاھر ھے کہ ان کے نیچرل اسلوب کی ایک بڑی خوبی سادگی اور بے تکلفی سمجھی گئی ھے اور حقیقت میں مناسب حد تک یہ خوبی ھے بھی! مگر مولانا حالی کی بعض آرا غور کے قابل ھیں۔ مثلاً وہ فرماتے ھیں کہ " سر سید گرامر کی پابندی سے فطرتاً آزاد تھے۔ وہ ان قیدوں سے جو شاعروں اور منشیوں نے مقرر کی ھیں مطلقاً آزاد تھے ،،۔ اس حد تک رائے معتدل ھے مگر اس کے بعد وہ یہ بھی فرماتے ھیں کہ " وہ ان غلط لفظوں کو جو عام فہم اور خاص و عام کی زبان پر جاری ھوں، صحیح لفظوں پر ترجیح دیتے تھے،،۔ ان عبارتوں سے بڑے خوفناک مغالطے پیدا ھوتے ھیں، مثلاً اس خیال کو کہ وہ غلط لفظوں کو (بوجہ عام ھونے کے) صحیح لفظوں پر ترجیح دیتے تھے، سر سید کے حق میں کلمۂ خیر نہیں سمجھا جاسکتا۔ میرے خیال میں یہ رائے نہ واقعہ کے مطابق ھے نہ صحیح ھے! واقعہ شاید اسی قدر ھے کہ سید صاحب عام (اور عام فہم) لفظوں کو خواص کی زبان پر ترجیح دیتے تھے۔ سید صاحب کے اس رجحان پر کوئی اعتراض وارد نہیں ھوسکتا مگر ایسے لفظوں کو " غلط لفظ ،، کہنا شاید صحیح نہ ھوگا — لیکن اگر وہ فی‌الحقیقت (دانستہ) غلط لفظوں کو صحیح لفظوں پر ترجیح دیتے تھے تو اس صورت میں سید صاحب کے ادبی ذوق اور زبان دانی کے حق میں کوئی اچھی رائے قائم نہیں کی جاسکتی۔ سید صاحب کی اس خصوصیت کو نہ حسن بیان کہا جاسکتا ھے نہ نیچرل طریق اظہار نہ سادگی نہ بے تکلفی — یہ محض غلط نگاری ھے اور بس — ھم سید صاحب کو یقیناً غلط نگار نہیں کہہ سکتے وہ اچھے زبان داں تھے اور اچھے انشا پرداز بھی — ان میں اگر کوئی خاص بات تھی تو یہ تھی کہ ان کے تمام اظہارات کا مقصد ادبی حسن کی تخلیق و تکمیل نہ تھا بلکہ چند مطالب کا ابلاغ تھا جن کو وہ ایسی زبان میں جیسے عام و خاص

سمجھ سکتے ہوں ادا کرنے کی کوشش کرتے تھے۔ اس کوشش میں عوام کے الفاظ اور ان کے محاورات بھی استعمال میں آجاتے تھے، مگر یہ الفاظ نہ تھے کیونکہ عوام کے سب الفاظ کو غلط نہیں کہا جاسکتا البتہ یہ کہا جاسکتا ہے کہ وہ علمی اشراف اور ادبی ابطال کی ٹکسالی لغت کے الفاظ نہ تھے۔ غلط لفظوں میں اور عوام کے الفاظ میں بہت بڑا فرق ہے۔

سوال یہ ہے کہ کسی لفظ کے صحیح یا فصیح ہونے کا معیار کیا ہے؟ یہ مسلم ہے کہ جو لفظ مقتضائے حال کا مکمل اظہار کرتا ہو وہ صحیح بھی ہے اور فصیح بھی۔ جو لفظ یا کلام متکلم یا ادیب کے تجربات اور معانی کی پوری پوری نمائندگی کرتا ہے (یہاں تک کہ متکلم اور سامع اس کے ابلاغ سے مطمئن ہوگئے ہوں) وہ بہر حال فصیح سمجھا جائے گا۔ بعض اوقات وحشی، غریب اور عوامی الفاظ مقتضائے حال کو اس خوبی سے بیان کرتے ہیں کہ زبان کے "ٹکسالی" الفاظ ان کی قائم مقامی نہیں کرسکتے۔ اس بنا پر حالی کی یہ رائے محل تامل ہے اور بے ساختگی اور سادگی کے اصول کی بے جا پاسداری۔ سید صاحب کے بیان کی بے ساختگی مسلم ہے مگر بے ساختگی میں غلط لفظوں کے جواز سے اتفاق نہیں کیا جاسکتا۔ سید صاحب قواعد وغیرہ سے فطرۃً آزاد تھے اس کا سبب بھی یہ ہے کہ وہ منصباً ادیب نہ تھے ان کی تحریر و تصنیف کا نصب العین ادب ہرگز نہ تھا۔ انہوں نے اپنی تصانیف کو ادبی کوشش کی حیثیت سے اگر پیش بھی کیا ہے تو اس کا نمبر بہت بعد میں آیا ہے۔ ان کا مقصود صرف یہ تھا کہ لوگ ان کی بات اور ان کے خیالات سن لیں خواہ ان کی شکل کچھ ہی ہو۔ یہ بھی درحقیقت اظہار کی ایک صورت ہے اور غیر ادبی ہونے پر بھی ایک ادبی سرگرمی ہے اس لیے کہ ان اظہارات کے پیچھے ایک سرگرم جذبہ کارفرما ہے جو ان کی تحریروں میں روح کی طرح جاری و ساری ہے --- جذبہ ہی ادب کا سنگ بنیاد ہے، اس لحاظ سے سید صاحب ادیب نہ ہونے پر بھی ادیب تھے۔

مولانا حالی نے لفظ و معنی کے باہمی تعلق پر عمدہ بحثیں کی ہیں۔ نظری اعتبار سے وہ ان الفاظ کو جسم اور معانی کو روح قرار دیتے ہیں۔ ابن خلدون کی اس تشبیہ کو (" کہ الفاظ کو ایسا سمجھو جیسے پیالہ اور معانی کو ایسا سمجھو جیسے پانی۔ پانی کو چاہو سونے کے پیالہ میں بھرلو اور چاہو چاندی کے پیالہ میں .... پانی کی ذات میں کچھ فرق نہیں آتا مگر سونے یا چاندی وغیرہ کے پیالے میں اس کی قدر بڑھ جاتی ہے...")

بڑے ادب سے مسترد کردیتے ہیں مگر چند سطروں کے بعد خود ہی اس میں یہ کہہ کر ترمیم بھی کردیتے ہیں کہ " ہم یہ بات تسلیم کرتے ہیں کہ شاعری کا مدار جس قدر الفاظ پر ہے اس قدر معانی پر نہیں "۔(مقدمہ شعر و شاعری ص ۶۲) ۔ تعجب یہ ہے کہ ان کا بنیادی نظریہ (جسم و روح) عملی تنقید میں بالکل بکھر کر رہ جاتا ہے، چنانچہ وہ بہت سے موقعوں پر لفظوں پر انفراداً بھی بحث کرتے ہیں اور معانی کو الگ چیز قرار دیتے ہیں، گویا یہ جسم اور روح الگ الگ رہ کر بھی اپنا کام کرسکتے ہیں۔ انشا پردازی اور شاعری کا مدار زیادہ لفظوں پر قرار دینے کے بعد اسلوب کی ہیئت موجودہ کا تصور ان کی تصانیف میں پایا جانا خلاف توقع ہے، تاہم کہیں کہیں وہ اپنے بنیادی نظریے کی طرف ضرور رجوع کرتے ہیں۔ چنانچہ کلام میں حسن کے سوال پر ایک مرتبہ پھر ہمیں یقین دلاتے ہیں کہ "کلام میں حسن تبھی پیدا ہوسکتا ہے جب لفظی اور معنوی خوبیاں عبارت میں (مصنف کے عمدہ خیالات کے ماتحت) اس طرح گھل مل جاتی ہیں کہ ہر مقام کا تقاضا بھی پورا ہوجاتا ہے اور بیان اتنا صاف اور سادہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ معلوم نہیں ہوتا کہ اس میں بتکلف محاسن پیدا کئے گئے ہیں (۱)

اس موقعے پر مصنف کی ' ہمت '، ' مقام کا اقتضا '، " محاسن لفظی و معنوی کا گھل مل جانا " اور " بیان کا سادہ معلوم ہونا "۔ ان جملوں سے مولانا حالی نے اسلوب کی ماہیت اور اس کے مختلف اجزا کے باہمی رشتے کو بڑی کامیابی کے ساتھ واضح کیا ہے۔

معانی و بیان کے قدیم نظریے تشبیہہ و استعارہ کو کلام کا زیور قرار دیتے ہیں بیان کا جزو نہیں سمجھتے۔ مولانا حالی بھی اس خیال کے تابع معلوم ہوتے ہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ استعارہ و تشبیہہ کی جڑیں بھی خیال کی طرح بہت گہری اس کی شاخیں تجربے اور خیال کے ساتھ ساتھ اُبھرتی ہیں اور بیان کا جزو بن کر باہر آتی ہیں۔ یہ بیان کا کوئی الحاق وصف نہیں بلکہ ادیب اور شاعر کی فطرت کا ایک وصف ہے جو خیال کے ساتھ خیال کی مصوری کرتا ہوا خارج میں نمودار ہوتا ہے اور ادیب اور شاعر کے ذہن اور نظر و فکر کے رنگ اور رجحان کی غمازی کرتا ہے۔ مگر معلوم نہیں مولانا حالی کی مسلم بصیرت تشبیہہ و استعارہ کی ماہیت تک کیوں نہ پہنچ سکی۔ انہوں نے رفارمر اور ادیب کا مقابلہ کرتے ہوئے تشبیہہ و استعارہ کو اظہار کی بجائے اخفا کا ذریعہ قرار دیا ہے۔

---

(۱) حیات جاوید ج ۲، صفحہ ۱۹۴۔

" رفارمر واقعات پر تشبیہہ و استعارہ کے پردے نہیں ڈالتا بلکہ ان کی ننگی تصویر کھلم کھلا سب پر ظاہر کرتا ہے " (حیات جاوید)

مگر غریب استعارہ و تشبیہہ سے یہ پردہ داری منسوب کی نہیں جاسکتی - ان سے تو مدھم نقوش اور واضح ہو جاتے ہیں، اظہار کے بہت سے پردے ہٹ جاتے ہیں اور تصویر روشن سے روشن تر ہوجاتی ہے - یہ خیال کہ رفارمر ان سے کام نہیں لیتا اور شاعر لیتا ہے صحیح معلوم نہیں ہوتا، کیونکہ انشاپرداز ہو یا شاعر مصلح ہو یا رفارمر کسی کو بھی ان سے کام لیے بغیر چارہ نہیں - ایک عام آدمی کی گفتگو بھی (جب اس کو کسی جذبے کا اظہار مقصود ہوتا ہے) ان سے خالی نہیں ہوسکتی، اور رفارمر اور خطیب کھیلتا ہی جذبے سے ہے، پھر اس کا بیان ان سے کیونکر خالی ہوسکتا ہے ؟

یہ خیال کہ رفارمر ان واقعات کی " ننگی تصویر " کھلم کھلا سب پر ظاہر کرتا ہے بہت مبہم ہے - محولہ بالا عبارت میں ننگی تصویر سے بظاہر مراد یہ ہے کہ رفارمر تشبیہہ و استعارہ کی مدد کے بغیر واقعات کی ہوبہو تصویر کھینچتا ہے - مولانا حالی کے ان بیانات سے یہ محسوس ہوتا ہے کہ وہ تشبیہہ و استعارہ کو مبالغہ اور جھوٹ کا نمائندہ قرار دیتے ہیں جن کا کام سچ اور حقیقت پر پردہ ڈالنا ہے، سچ اور حقیقت کو ظاہر کرنا نہیں، حالانکہ یہ دونو چیزیں ازخود سچ یا جھوٹ کی مرتکب نہیں ہوسکتیں - اگر ادیب یا شاعر اپنے تجربے کے اظہار میں خلوص و صداقت پر عامل ہے تو اس کا بیان اور اس کے سب پیرائے خلوص و صداقت سے معمور ہوں گے، اس کے علاوہ فنی صداقت اور اخلاقی صداقت میں فرق بھی تو بہت ہے -

یہ ہیں کم و بیش حالی کے خیالات اسلوب کے متعلق ! اب صرف اس سوال کا جواب دینا باقی ہے کہ مکمل اسلوب بیان کے متعلق ان کا تصور کیا ہے ؟ ان کے مختلف بیانات پر مجموعی نظر ڈالنے سے اس بات کا احساس ہوتا ہے کہ ان کے نزدیک اسلوب دو طرح کے ہوتے ہیں : اول عظیم اسلوب جن کا تتبع نہیں کیا جاسکتا، دوم سادہ اور عام اسلوب -

" بعضے اسٹائل ایسے اچھوتے اور شارع عام سے بعید ہوتے ہیں کہ اور لوگ ان کا تتبع کرنے کی دسترس اپنے میں نہیں پاتے اور بعض ایسے سپاٹ اور سیٹھے پھیکے ہوتے ہیں کہ ان کی طرف کسی کی توجہ نہیں ہوتی اور اس لیے دونوں قسم کے اسٹائلوں کا عام لٹریچر پر کوئی معتدبہ اثر نہیں ہوتا "

(حیات جاوید ج ۲ صفحہ ۹۶ م)

مولانا حالی نے حیات جاوید میں سرسید کے اسلوب کے متعلق جو کچھ لکھا ہے اس میں بے تکلفی اور سادگی پر بڑا زور دیا ہے۔ انہیں سید صاحب کی قدرت بیان کے علاوہ ان کی تحریر کا یہ وصف بھی اچھا معلوم ہوتا ہے کہ " وہ عام تحریروں کو اپنی سطح پر لے آئے ہیں " دوسرے الفاظ میں ان میں یہ قدرتی قابلیت پائی جاتی تھی کہ ہر مضمون پر لکھ سکتے تھے اور عام فہم انداز میں اپنے قدرتی انداز میں لکھ سکتے تھے۔ وہ مشکل مضمون کی خاطر اپنی عام سطح سے نہیں ہٹتے تھے۔ بلکہ مضمون کو عام سطح پر لے آتے تھے۔ ان کے اس وصف سے ادب کو بڑا فائدہ پہنچا۔

اس میں کچھ شبہ نہیں کہ مولانا حالی کا محبوب اسلوب خلوص اور سادگی کے وصف سے خالی نہیں ہوسکتا، مگر اس امر کے باور کرنے کے وجوہ موجود ہیں کہ سید صاحب کے اسلوب کی درشت اور کرخت سادگی ان کے پسندیدہ اسٹائل کے اوصاف میں شامل نہیں ہوگی خواہ اس سے ادب کو معتدبہ فائدہ پہنچتا ہو یا نہ پہنچتا ہو۔ ان کا مرغوب اسٹائل معنی اور صورت کی خوبیوں کا مجموعہ ہوگا جس میں سچائی اور لفظی اور معنوی محاسن اس طرح "گھل مل گئے ہوں" کہ غور کئے بغیر وہ بیان محض سادہ بیان معلوم ہوتا ہو۔

یہ ان کے مثالی اسلوب کا تصور ہے! ان کے محبوب ادیبوں میں صرف سعدی ان کے اس نصب العین کے قریب معلوم ہوتے ہیں، چنانچہ حیات سعدی میں شیخ کے اسٹائل کی بے حد مدح و توصیف کی ہے۔ ان کی لذت سے ان پر وجد و تواجد کی کیفیت طاری ہوجاتی ہے جس کا ثبوت اس بات سے ملتا ہے کہ اس موقعہ پر وہ بڑی دلکش تشبیہات و تمثیلات لاتے ہیں ——— حالی کے انداز بیان کا ایک خاصہ یہ ہے کہ وہ جوش جذبات کے موقع پر تشبیہوں تمثیلوں سے کام لیتے ہیں) ——— ! اندازہ یہ ہے کہ وہ سعدی کی شخصیت کی طرح ان کے اسلوب کو بھی بہت بڑا درجہ دیتے ہیں۔ سعدی کے بیان میں سادگی اور تجمل کا ایسا عجیب و غریب اجتماع ہے جو اسلوب کی تاریخ میں شاذو نادر ہی نظر آتا ہے۔

مولانا حالی کا قول ہے کہ :—

" ان دونوں کتابوں (یعنی گلستان اور بوستان) میں یہ بات بھی تعجب انگیز ہے کہ باوجودیکہ صنائع لفظی و معنوی ان میں کثرت سے موجود ہیں اور تقریباً نصف گلستان کے فقرے مسجع اور مقفیٰ ہیں، بایں ہمہ وہ سادگی میں

ضرب‌المثل ہیں .... فی الواقع یہ شیخ کے کمال انشا پردازی کی ایک بہت بڑی دلیل ہے،،۔ شیخ کی نثر میں مسجع اور مرصع فقرے سادے فقروں میں ایسے ملے ہوے ہیں '' جیسے پشمینے کی شال میں ریشم کے تار،،۔

سعدی کے اسلوب بیان میں جو حسن و جمال پایا جاتا ہے حالی نے اس کی مفصل تشریح کی ہے۔ ان کے نزدیک ان کے بیان کے لطف و اثر کا ایک بڑا سبب یہ بھی ہے کہ اس میں صدق اور اصلیت و واقعیت پائی جاتی ہے۔ حالی کے بعض بیانات سے یہ شبہ ہوسکتا ہے کہ وہ سعدی کے سٹائل کو ایک مثالی اسلوب بیان قرار دیتے ہیں جس کا وصف یہ ہے کہ اس میں باوجود صنعت کے نہایت بے تکلفی اور باوجود ساختگی کے کمال بے ساختہ پن پایا جاتا ہے۔

یہ سعدی کے اسلوب بیان کی مسلم خوبیاں ہیں۔ ان کا اعتراف حالی کی طرح اور لوگ بھی کرچکے ہیں، مگر قیاس یہ کہتا ہے کہ ہرچند سعدی کا اسلوب بیان حالی کے نصب العین کے قریب ہے مگر ان کے مکمل اسلوب بیان کے تصورات کی پوری نمائندگی نہیں کرتا۔ سعدی بڑے صاحب اسلوب سہی مگر ایک تو ان کا طرز بیان '' ناقابل تقلید،، ہے پھر اس میں کسی حد تک تکلف بھی پایا جاتا ہے (خواہ اس کے برے پہلو کم سے کم ہی کیوں نہ ہوں) اس وجہ سے یہ اس تصوری اور مثالی طرز بیان سے کسی حد تک مختلف ہے جس کی تصویر حالی نے بار بار اپنی تصانیف میں بنائی ہے۔ بیان سعدی کا تحمل، اس کی شان، اس کی صنعت کا کمال، اس کی چھپی ہوئی لطافتیں اور نکتے اور ظرافت—سب درست۔ مگر ایک خامی جو ان کے کلام میں ضرور ظاہر ہوجاتی ہے وہ ہے ان کا بے ضرورت تکلف جس سے بوستان اور گلستان کا خوش رنگ قماش تیار ہوا ہے۔ اور ظاہر ہے کہ بے ضرورت تکلف خلوص اور صداقت کے منافی ہے۔ پس ایسا اسلوب جس میں تکلف اور بناوٹ کا ہلکا سا رنگ بھی ہو وہ (جہاں تک ہم حالی کو سمجھ سکتے ہیں) حالی کا محبوب ترین اسلوب قرار نہیں دیا جاسکتا۔ میری عاجزانہ رائے میں حالی کا مثالی اسلوب بیان ان کا اپنا اسلوب بیان ہے جس میں سرسید کی سادگی اور سعدی کے حسن بیان کا لطیف اجتماع ہے۔ اس میں '' محاسن لفظی عبارت میں اس طرح گھل مل گئے ہیں کہ جب تک بنظر غور نہ دیکھا جائے عام بیان ان سے سادہ معلوم ہوتا ہے،،

——:o:——

بے زبانوں کی زبان ۔ حالی

(از صالحہ عابد حسین)

خواجہ الطاف حسین حالی کی ذات چودھویں صدی کی ایک ایسی زندۂ جاوید شخصیت ہے جس میں قدرت نے بڑی خوبی کے ساتھ انسانی اور ملکوتی صفات کو سمودیا تھا ۔ ان میں اتنی بہت سی خوبیوں کا امتزاج نظر آتا ہے جن میں سے ہر ایک کے بیان کے لیے ایک ایک الگ مضمون کی ضرورت ہے ۔ مجھے اس وقت صرف ایک پر کچھ روشنی ڈالنی ہے یعنی عورت کا درجہ ان کی نظر میں کیا تھا اور انھوں نے اس کے لیے کیا کیا ؟

یوں تو ہوش سنبھالتے ہی سب سے پہلے کان میں جو باتیں پڑیں ان میں حالی کا ذکر اور حالی کا کلام خاص طور پر اہمیت رکھتا ہے ۔ پھر جوں جوں عمر بڑھی، ان کا ذکر بزرگوں سے سن کر بھی اور ان کی نظم و نثر کو پڑھ کر، حالی کی دلکش سیرت میرے دل کو اپنی طرف کھینچتی گئی ۔ نظم اور نثر میں ان کا صاف، سادہ، واضح اور دلنشین انداز مجھے اتنا زیادہ متاثر کرتا تھا کہ دوسرے لوگوں کی بڑی بڑی مرصع اور مسجع عبارتیں اور رنگین تحریریں اس کے مقابلے میں پھیکی نظر آتی تھیں ۔ اور آئندہ کے لیے بھی کم سے کم نثر میں تو وہی مصنف میرے محبوب بن سکے جن کے ہاں بناوٹ اور آورد کی جگہ سادگی، خلوص اور وضاحت و دل نشینی ہو۔

یادگار حالی لکھنے کے سلسلے میں مجھے حالی کی تصانیف کا زیادہ سنجیدگی اور گہری نظر سے مطالعہ کا موقع ملا ۔ اور اس سے ایک یہ حقیقت مجھ پر کھلی کہ مولانا عبدالحق نے حالی کی سیرت کی جو دو سب سے نمایاں خصوصیتیں سادگی اور درد دل بتائی ہیں وہ بالکل سچ ہے ۔ سادگی بیان میں، زبان میں، نظم اور نثر میں، کردار اور گفتار میں، ہر جگہ ہر موقع پر دیکھ لیجیے ۔ اور درد دل تو وہ شے ہے جس کا پرتو ان کی زندگی کے ہر ہر گوشے میں نظر آتا ہے ۔ ان کی ساری زندگی ہمدردی، درد مندی، رقت قلب، ایثار و فیاضی سے عبارت ہے اور یہ وہ صفات ہیں جو صرف اس شخص میں مل سکتی ہیں جسے خدا نے درد دل کی بے بہا دولت

دی ہو اور خوش قسمتی سے حالی کو یہ عطیہ بڑی فیاضی سے بخشا گیا تھا ۔ وہ ہر کسی کی تکلیف پر کچھ اس طرح سے چپ ہو جاتے تھے جیسے یہ خود آن پر بیت رہا ہے ۔ حالی کا یہ شعر

چیست انسانی ؟ تپیدن از غم ہمسا یگاں از سموم نجد درباغ عدن پژماں شدن

ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے خود ان کی زندگی کی تفسیر ہو ۔

اور ان دو صفتوں میں ایک اور کا اضافہ کرلیجیے جو اسی حد تک موجود تھی ۔ یعنی حالی کا خلوص ۔ حالی کی ہر تصنیف ، ہر شعر ، ہر لفظ اس بات کا شاہد ہے کہ وہ جو کہتا ہے اُس میں ریاکاری ، بناوٹ ، مصلحت کا شائبہ تک نہیں ، حالی وہی کہتا ہے جو اُس کے دل کی گہرائیوں سے نکلتا ہے ، اور بلا خوف و رعایت کہتا ہے ۔ ڈنکے کی چوٹ کہتا ہے ۔

حالی نے زندگی بھر زبان ، ادب ، ملک ، قوم ملت کی جو خدمتیں انجام دیں وہ ایسی نہیں جنہیں بھلا دیا جاسکے ۔ مگر اس میں شک نہیں کہ اُس وقت حالی کے ساتھ کچھ اور لوگ بھی تھے جو قوم کے درد مند اور رہبر اور زبان و ادب کے مصلح اور خادم تھے اور ان میں سرسید کی ذات اپنا ایک ایسا بلند مقام رکھتی ہے جس کی بلندی کو کوئی اور نہیں چھو سکتا ۔ لیکن سرسید نے قوم کی رہبری کے ساتھ ساتھ انسانیت کے آدھے حصے ، یعنی عورت کی طرف سے جو چشم پوشی برتی وہ ایسی نہیں جسے چھپایا جا سکے ۔ یہ الزام تو غلط ہے کہ سرسید عورتوں کی تعلیم کے مخالف تھے ، اس لیے کہ ان کی بعض تقریروں اور تحریروں سے اس کا ثبوت ملتا ہے کہ وہ عورت کی جہالت کو برا سمجھتے تھے اور اس کو بھی تعلیم پانے کا حق دار جانتے تھے لیکن جہاں تک عملی دنیا کا تعلق ہے ، انھوں نے اس بے بس اور مجبور فرقے کی اصلاح کی کوئی قابل ذکر کوشش نہیں کی جو اُس وقت جہالت کی اور سماج کی زیادتیوں سب سے زیادہ شکار بنی ہوئی تھی ۔ لیکن سرسید کی اس کمی کو ان کے دوست ، ساتھی ، ان کے معتقد ، مداح اور ممدوح حالی نے ضرور پورا کیا ۔

حالی بھی اپنی قوم کی جہالت کو دور کرنا چاہتے تھے مگر وہ صرف مردوں کے ہی تعلیم پر اکتفا کرنے پر تیار نہ تھے بلکہ عورت کو بھی علم کی روشنی بخشنا چاہتے تھے ۔ انھیں اس بات کا شدت سے احساس تھا کہ مردوں کی خود غرضی نے مسلمان عورت سے وہ حقوق چھین لیے ہیں جو اسلام جیسے روادار اور انسانیت دوست مذہب نے اسے عطا کیے ہیں اور اسے جہالت کے اندھیرے میں گھونٹ کر اس پر من مانے مظالم ڈھائے جارہے ہیں ۔ اس

زمانے میں جب عورت کے حق کی طرف کسی کا دھیان بھی شاید کم ہی جاتا تھا ۔ حالی نے اس کی حمایت میں سب سے زوردار آواز بلند کی ۔ حالی صاحب قلم تھے اور ان کا اصلی مقام اسی میدان میں نبرد آزمائی کرنا تھا، لیکن اس کے ساتھ ساتھ وہ اپنے بس بھر عملی طور پر بھی عورتوں کی تعلیم و ترقی کے لیے کچھ نہ کچھ کرتے رہے ۔ ان کے زمانے سے ان کے خاندان میں یہ بدعت شروع ہوگئی تھی کہ لڑکی کی شادی کے لیے اس کی مرضی ضرور لی جائے ۔ یوں بھی ان کے خاندان میں عورت کو اپنی چار دیواری کے اندر پورے پورے مالکانہ حقوق حاصل تھے ۔ عورتوں کی تعلیم حالی کے شہر اور خاندان میں بھی اس صدی کے ثانوی نیصدی گھرانوں کی طرح نہ ہونے کے برابر تھی ۔ بہت ہوا تو طوطے کی طرح کلام مجید پڑھادیا گیا اور اس کے سہارے کچھ ٹوٹی پھوٹی اردو آگئی اور مذہبی مسئلے مسائل سے واقفیت کے لیے اتنی " تعلیم " بہت کافی سمجھی جاتی تھی ۔ حالی کو ہر پرخلوص اور با عمل آدمی کی طرح سب سے پہلے اپنے ہی بت توڑنے تھے ، چنانچہ انہوں نے عورتوں کے لکھانے پڑھانے کا " عیب " سب سے پہلے اپنے ہی گھر سے شروع کیا ۔ میری والدہ جو مولانا حالی کی سب سے بڑی پوتی تھیں سنایا کرتی تھیں کہ مجھے کلام مجید اور مذہبی کتابیں تو استانی سے پڑھوادی گئیں تھیں لیکن لکھنا سیکھنے کی عورتوں کی سخت ممانعت تھی اور ان کے والد اور چچا پانی پت سے باہر اپنی نوکریوں پر رہتے تھے اور دادا دوسرے مردانے گھر میں ۔ والدہ کے دل میں بچپن سے ہی لکھنے کا شوق موجود تھا جو ہر رکاوٹ کو دور کرنے پر تل گیا ۔ جب ان کی دادی سوجاتیں تو وہ اندر کی صحنچی میں بیٹھ کر توے کی سیاہی گھولتیں ، سرکنڈے کو تراش کر قلم بناتیں اور اپنی کتاب کی عبارت دیکھ دیکھ کر ویسے ہی حرف بنایا کرتیں اور اس طرح وہ خاصا لکھنا سیکھ گئیں ۔ ایک دن ان کی دادی نے دیکھ لیا تو بہت ناراض ہوئیں ۔ وہ پوتی کو بیحد چاہتی تھیں مگر یہ کیسے گوارا کرتیں کہ کوئی ان کی چہیتی بچی کے لیے یہ کہے کہ وہ خط پتر لکھتی ہے؟ لیکن کسی طرح یہ خبر مولانا حالی تک جا پہنچی تو انہیں بڑی خوشی ہوئی ۔ انہوں نے پوتی کو لکھنا سیکھنے کی اجازت دلوادی اور ان کے لیے سب سامان لکھنے کا فراہم کردیا اور خود ان کو اصلاح دینے لگے ۔ والدہ کا خط ایسا خوبصورت اور پختہ تھا کہ آج کل کی اعلیٰ تعلیم یافتہ لڑکیوں کا بھی نہیں ہوتا ۔ پھر تو جو رکاوٹ تھی وہ دور ہوگئی اور آئندہ سب لڑکیوں نے کچھ نہ کچھ لکھنا ضرور سیکھا ۔ حالی کے خطوں میں بعض جگہ اس کا ذکر

ملتا ہے جس میں وہ لڑکیوں کو تعلیم کی تلقین کرتے رہتے تھے۔ اپنے دوسرے بیٹے خواجہ سجاد حسین کو ایک خط میں ان کی چھوٹی بچی کے متعلق لکھتے ہیں :۔

"سرورہ کے ہاتھ کا کارڈ دیکھ کر بہت خوشی ہوئی۔ وہ جب کبھی خط یا کارڈ یا مشق کے طور پر کچھ لکھیں پنسل سے کاغذ پر خط کھینچ دینے چاہئیں تاکہ انہیں سیدھی سطر لکھنے کی عادت پڑے........کبھی کبھی حساب کے سوالات بھی ان سے کرانے چاہئیں اور دونوں بہنوں کے پاس سلیٹ اور پنسل ہونی چاہیے....."

سنہ ۱۸۹۴ع میں انہوں نے پانی پت میں اپنے گھر سے متصل مکان میں لڑکیوں کا ایک اسکول کھولا تھا۔ خواجہ سجاد حسین جو اس زمانے میں انسپکٹر مدارس تھے ان کے مشیر اور مددگار تھے۔ اسکول کی مالی مدد بھی وہی کرتے تھے یہ وہ زمانہ تھا جب حالی بہت بوڑھے ہوچکے تھے اور اپنے وطن ہی میں مستقل مقیم رہ کر تصنیف و تالیف کا کام کرتے رہتے تھے۔ یہ اسکول چوتھی جماعت تک کا تھا۔ اس کا معیار خاصا اونچا تھا، یعنی لڑکیوں کو اچھی طرح پڑھنا، خاصا لکھنا، کچھ حساب وغیرہ آجاتا تھا اور دستکاری سلائی وغیرہ بھی سکھائی جاتی تھی۔ اس میں اچھی خاصی بڑی بڑی لڑکیاں بھی پڑھتی تھیں جو زیادہ تر حالی کے وسیع خاندان کی تھیں یا ان کے دوستوں کی۔ انہیں اسکول کی ترقی کے ساتھ ساتھ لڑکیوں کے آرام کا بھی بڑا خیال رہتا تھا اور ان کی آسانی کا بھی لحاظ رکھتے تھے۔ وہ جانتے تھے کہ بڑی لڑکیاں گھر میں ماں کا ہاتھ بٹاتی اور گھرداری کے کاموں میں مدد دیتی ہیں۔ اگر پڑھائی کی وجہ سے گھر کے کام میں ہرج ہوا تو مائیں ان کے پڑھنے میں ضرور رکاوٹ ڈالیں گی۔ ایک خط میں خواجہ سجاد حسین کو لکھا ہے " لڑکیوں کے مدرسے کے لیے ایک پنکھا تیار ہونا چاہیے اور ایک لڑکا پنکھا کھینچنے کے لیے نوکر رکھنا چاہیے ورنہ برسات کا موسم اس تنگ مکان میں مشکل سے کٹے گا۔ اور اگر ممکن ہو تو چھ سات بجے سے بارہ یا گیارہ بجے تک کا وقت بہت مناسب ہے کیوں کہ بڑی لڑکیاں جو گھر کا کاروبار کرتی ہیں ان کا بڑا ہرج ہوتا ہے..."

اسکول میں دلی کی ایک استانی پڑھاتی تھیں۔ اس زمانے میں کسی اچھی پڑھی لکھی عورت کا مدرسے میں پڑھانے کے لیے حاصل کرنا محال تھا۔ معمولی پڑھی لکھی استانی مل جانا ہی غنیمت تھا۔ لیکن سال بھر میں لڑکیاں اس استانی کے برابر ہوگئیں۔ کچھ عرصے بعد

اسکول جاری رہا پھر غالباً استانی نہ مل سکنے کے باعث بند ہوگیا۔ لیکن پانی پت میں عورتوں کے پڑھنے لکھنے کا جو چرچا ہوگیا تھا وہ بند نہ ہوسکا اور دبے دبے دبا جاتا رہا۔

حالی عورت کو بہت اونچے مقام دیتے تھے مگر ساتھ ساتھ وہ اس سے بھی واقف تھے کہ صدیوں کی جہالت اور غلامی نے اس میں کیا کچھ کمزوریاں پیدا کردی ہیں۔ خاص طور پر بچوں کی پرورش اور تربیت کے ڈھنگ اور اصولوں سے تو وہ بالکل ہی ناواقف ہے۔ اس مقصد کے لیے انھوں نے دلچسپ قصے کے پیرائے میں ایک کتاب مجالس النساء لکھی۔ اس میں عورتوں کی تعلیم اور بچوں کی تربیت اور تعلیم وغیرہ کے بنیادی اصول بہت ہی سادہ، دل نشین اور موثر انداز میں بتائے گئے ہیں۔ مدتوں یہ کتاب پنجاب کے زنانہ کورس میں شامل رہی۔ میرے بچپن تک عورتیں اور لڑکیاں اسے شوق اور دلچسپی سے پڑھا کرتی تھیں۔

حالی قدامت پرست تو نہ تھے لیکن پرانے زمانے کے بزرگ تھے اور پکے مذہبی انسان۔ وہ عورت کے لیے پردے۔ روایتی پردے۔ کو بھی بہت لازمی سمجھتے تھے لیکن اس کے باوجود وہ کسی صورت میں پردے کو عورت کی تعلیم و ترقی کی راہ میں رکاوٹ بننے دینا نہیں چاہتے تھے۔ ان کا عقیدہ تھا کہ اسلام نے عورت کو جتنے حقوق دیے ہیں، اور کون نہیں جانتا کہ کیا کچھ حقوق نہیں دیے۔ وہ بس پورے پورے اسے ملنے چاہئیں۔ اور صرف مسلمان عورت ہی نہیں دنیا کی ہر عورت کو مرد کی زیادتی اور سماج کے ظلم سے نجات دلانی چاہیے۔

حالی کو جب اور جہاں موقع ملا انھوں نے نظم اور نثر میں اپنے ان خیالات کا اظہار کیا ہے۔ اور معاشرے کی ان خرابیوں کی طرف لوگوں کی توجہ مبذول کی ہے جو عورتوں کی زندگیاں بگاڑنے کا سبب بنی ہوئی ہیں۔

لڑکیوں کی شادی میں بزرگ جس زیادتی اور خود رائی کو دخل دیتے ہیں اور اپنی مرضی اور پسند پر اپنی لڑکیوں کو قربان کردیتے ہیں وہ کس سے چھپا ہوا ہے؟ اس وقت کیا اب بھی ہمارے ہاں بیشتر گھرانے اس گناہ کے کرنے سے نہیں چوکتے۔ حالی نے اس پر بھی ایک قطعہ لکھا ہے —

جاہلیت کے زمانے میں یہ تھی رسم قدیم
کہ کسی گھر میں اگر ہوتی تھی پیدا دختر

سنگ دلی باپ اسے گود سے لےکر ماں کی
گاڑ دیتا تھا زمیں میں کہیں زندہ جاکر

رسم اب بھی یہی دنیا میں ہے جاری لیکن
جو کہ اندھے ہیں ہئیے کی نہیں کچھ ان کو خبر

لوگ بیٹی کے لئے ڈھونڈتے ہیں جب پیوند
سب سے اول انہیں ہوتا ہے یہ منظور نظر

ایسے گھر بیاہئے بیٹی کو جو ہو آسودہ
اور مہ و مہر سے جو ذات میں ہو افضل تر

چھان بین اس کی تو کرتے ہیں کہ گھر کیسا ہو
پر نہیں دیکھتا یہ کوئی کہ کیسا ہے بر

بدمزاجی ہو، جہالت ہو کہ ہو بدچلنی
کچھ برائی نہیں ڈھونڈتا ہے داماد اگر

یہ وہی ناشدنی ریت ہے جس کے کارن
بکریاں بھیڑیوں سے پاتی ہیں پیوند اکثر

اپنا اور بیٹیوں کا جب کہ نہ سوچیں انجام
جاہلیت سے کہیں ہے وہ زمانہ بدتر

چپ کی داد میں حالی نے عورت کی اعلیٰ خوبیوں اور اونچے مقام کا جس جوش خلوص اور محبت و احترام کے ساتھ، اعتراف کیا ہے، اس کے ایثار نفس اور بے غرض خدمت کے جذبے کو جس انداز سے سراہا ہے وہ ایک لاثانی چیز ہے۔ اردو ادب ہی میں کیا شاید دنیا کے کسی ادب میں بھی اس کی مثال نہ ملے۔ اسی کو پڑھ کر پوری طرح اندازہ ہوتا ہے کہ حالی کی نظر میں عورت کا درجہ کتنا بلند ہے۔

اے ماؤں بہنوں بیٹیوں، دنیا کی زینت تم سے ہے
ملکوں کی بستی ہو تمہیں، قوموں کی عزت تم سے ہے

نیکی کی تم تصویر ہو، عفت کی تم تدبیر ہو
ہو دین کی تم پاسباں، ایماں سلامت تم سے ہے

فطرت تمہاری ہے حیا، طینت میں ہے مہر و وفا
گھٹی میں ہے صبر و رضا، انساں عبارت تم سے ہے

تم آس ہو بیمار کی، ڈھارس ہو تم لاچار کی
دولت ہو تم نادار کی، عسرت میں عشرت تم سے ہے

حالی کا خیال تھا حق کا جذبہ مرد میں ختم ہوتا جاتا ہے اور دنیا میں اگر عورت نہ ہوتی تو اس سے خالی ہوجاتی :—

مردوں میں ست والے تھے جو ست بیٹھے اپنا کب کا کھو
دنیا میں اے ست ونتیوں ، لے دے کے ست آپ تم سے ہے

ماں کی عظمت کا اقرار ہمیشہ سے ہوتا آیا ہے ، حالی نے جس شان سے کیا ہے آپ بھی دیکھیے :—

لیتیں خبر اولاد کی ، مائیں نہ گر بچپن میں یاں
خالی کبھی کا اہل سے آدم کی ہوجاتا جہاں
وہ دین اور دنیا کے مصلح جن کے وعظ و پند سے
ظلمت میں باطل کی ہوا دنیا میں نور حق عیاں
وہ علم اور حکمت کے بانی جن کے تحقیقات سے
ظاہر ہوئے عالم میں اسرار زمین و آسمان
....
کیا انبیا ، کیا اولیا ، کیا غوث ، کیا قطب زماں
کیا پھول و پھل یہ سب انہیں کمزور پودوں کے نہ تھے
سینچا تھا ماؤں نے جنہیں خون جگر سے اپنے یاں

اور اس طرح ایک کرکے اس کی خوبیوں اور اس کے ایثار کا ذکر کرتے کرتے شاعر دنیا کا سب سے بڑا شرف عورت کو بخش دیتا ہے :—

کی تم نے اس دارالمحن میں جس تحمل سے بسر زیبا ہے گر کہیے تمہیں فخر بنی نوع بشر

اور ساتھ ہی اس کے انصاف پسند دل میں یہ بات بری طرح کھٹکتی ہے کہ ایسی ہستی جس میں انسانیت کی ایسی ایسی اعلیٰ قدریں موجود ہوں اس کو مرد نے علم کی روشنی سے جو ہر انسان کا حق ہے ، محروم کر رکھا ہے اور اس کے ساتھ یہ سلوک کہ :—

جب تک جیو تم، علم و دانش سے رہو محروم یاں

آئی ہو جیسی بے خبر، ویسی ہی جاؤ بے خبر

جو علم مردوں کے لیے سمجھا گیا آب حیات

ٹھہرا تمہارے حق میں وہ زہر ہلاہل سربسر

گزرے تھے جُگ تم پر کہ ہمدردی نہ تھی تم سے کہیں

تھا منحرف تم سے فلک برگشتہ تھی تم سے زمیں

دنیا کے دانا اور حکیم اس خوف سے لرزاں تھے سب

تم پر مبادا علم کی پڑجائے پرچھائیں کہیں

ایسا نہ ہو مرد اور عورت میں رہے باقی نہ فرق

تعلیم پاکر آدمی بننا تمہیں زیبا نہیں

لیکن حالی زمانے کی نبض پہچانتے تھے اور اب وہ یہ دیکھ رہے تھے کہ یہ دھاندلی زیادہ دنوں تک نہ چل سکے گی :—

نوبت تمہاری حق رسی کی بعد مدت آئی ہے

انصاف نے دھندلی سی اک اپنی جھلک دکھلائی ہے

گو ہے تمہارے حامیوں کو مشکلیں کا سامنا

ہر حل پر اک مشکل یونہی دنیا میں ہوتی آئی ہے

اٹکے ہیں روڑے چلتی گاڑی میں سچائی کی سدا

پر فتح جب پائی سچائی نے ہی آخر پائی ہے

حالی کی نظموں میں سب سے دل گداز اور اثر آفریں نظم مناجات بیوہ ہے جو حالی نے ۱۸۸۴ع کے لگ بھگ لکھی تھی اس نظم پر خود حالی کو ناز تھا اور کون کہہ سکتا ہے کہ یہ ناز بیجا تھا !

اس میں حالی نے ایک کم سن بیوہ کی درد ناک حالت کا جو سماج اور رواج کے ظلموں کا شکار ہے ایسا ہو بہو نقشہ کھینچا ہے جو اپنا جواب آپ ہی ہے۔ مولوی عبدالحق صاحب کی رائے ہے کہ :—

"مناجات بیوہ اور چپ کی داد دو ایسی نظمیں ہیں جن کی نظیر ہماری زبان میں کیا ہندوستان کی کسی زبان میں نہیں ملتی۔ ان نظموں کے ایک ایک مصرع سے خلوص، جوش، ہمدردی اور اثر ٹپکتا ہے۔ یہ نظمیں نہیں دل و جگر کے ٹکڑے ہیں۔ لکھنا تو بڑی بات ہے کوئی انھیں بے چشم نم پڑھ بھی نہیں سکتا ...."

رام بابو سکسینہ نے تو مناجات بیوہ کی تعریف میں مبالغہ کی انتہا کردی ہے کہ : "اس کو پڑھتے وقت اکثر شوہر دار عورتیں کہتی ہیں کہ کاش ہم بیوہ ہوتے تو اس سے زیادہ لطف اندوز ہوتے"۔ خیر تو لطف بیان کے لیے ایک بات کہی گئی ہے لیکن اس میں شک نہیں کہ سماج کی ستائی بیوہ عورتیں تو کیا، سہاگنیں اور کنواری لڑکیاں بھی اسے پڑھ کر تڑپ اٹھتی ہیں، بلکہ مرد بھی جو ایک حدتک ان مظالم کا ذمہ دار ہے، اس کو پڑھ کر بغیر متاثر ہوئے نہیں رہ سکتا۔ مجھے اس نظم کو پڑھ کر حیرت ہوتی ہے کہ حالی مرد ہوتے ہوئے بھی ایسا درد آشنا، ایسا حساس، اتنا نازک دل کہاں سے لائے جس نے کم سن بدنصیب بیوہ کے ہر ہر جذبہ اور ہر ہر دکھ کو بالکل اس طرح محسوس کیا جیسے یہ سب اُس پر بیت رہا ہو ؟ مگر سوچتی ہوں - یہی تو حقیقی شاعر کی پہچان ہے اور سچے شاعر کا کمال ہے۔ ہر ایک کی بپتی اُس پر بیت جاتی ہے اور تب ہی وہ ایسی زندۂ جاوید چیز لکھتا ہے جیسی مناجات بیوہ۔

اس نظم کا ہندوستان کی دس بارہ زبانوں میں ترجمہ ہوچکا ہے اور مجھے تو یقین ہے کہ ہر زبان میں یہ اتنی ہی مقبول ہوئی ہوگی جیسی اردو میں، اس لیے کہ بیوہ کی جو حالت اس میں دکھائی گئی ہے وہ ہمارے دیس کے ہر ہر حصہ میں نظر آسکتی ہے مناجات کی انتہائی قبولیت اور دل پذیر ہونے کی ایک وجہ تو خیر اس کی زبان کی شیرینی اور سادگی ہے لیکن اسی کے ساتھ اس کے لیے شاعر نے جو انداز بیان اختیار کیا ہے وہ بھی بہت کچھ اس کا ذمہ دار ہے۔ شاعر اگر اپنی زبان سے بیوہ عورت کی بدحالی اور مصیبت بیان کرتا، لوگوں کو ان سختیوں کی طرف متوجہ کرتا جو اُس پر روا رکھی جاتی ہیں تو وہ ایک اصلاحی نظم تو ضرور ہوتی، لیکن یقیناً اتنا گہرا اثر دلوں پر نہ چھوڑ سکتی جو اس طرز بیان نے ڈالا۔ بیوہ نے خود اپنی زبان سے اپنی بپتا کی کہانی سنائی ہے۔ اور وہ بھی کسے ؟ اسی کو جو بے آسوں کی آس بے سہاروں کا آخری سہارا، مظلوم کی دادرسی کرنے والا ہے۔ جس سے ایک دکھیا بیوہ دہی، سب کچھ دل کھول

کر کہہ سکتی ہے۔ اس یقین کے ساتھ کہ وہ اس کا درد آشنا اور اس کی سننے والا ہے۔

اے میرے زور اور قدرت والے — حکمت اور حکومت والے
میں لونڈی تیری دکھیا ری — دروازے کی تیرے بھکاری
موت کی خواہاں، جان کی دشمن — جان پہ اپنی آپ اجیرن
سہہ کے بہت آزار چلی ہوں — دنیا سے بیزار چلی ہوں
دل پر میرے داغ ہیں جتنے — منہ میں بول نہیں ہیں اتنے
بیاہ کے دم پائی تھی نہ لینے — لینے کے یاں پڑگئے دینے
ایک خوشی نے غم یہ دکھائے — ایک ہنسی نے گل یہ کھلائے
رو نہیں سکتی تنگ ہوں یاں تک — اور روؤں تو روؤں تو کہاں تک
دن ہیں بھیانک رات ڈراؤنی — یوں گزری یہ ساری جوانی
صبر سے بچپن کا ہے رنڈاپا — دور پڑا ہے ابھی بڑھاپا

ان شعروں کو پڑھیے ——جسم کے رونگٹے کھڑے ہوجاتے ہیں۔ اف ہمارے دیس کی عورت کی بے بسی:

چین گر اپنی بانٹ میں آتا — کیوں تو عورت ذات بناتا
کیوں پڑتے ہم غیر کے پالے — کیوں ہوتے اوروں کے حوالے
دکھ میں نہیں یاں کوئی کسی کا — باپ نہ ماں، بھائی نہ بھتیجا

کس درد سے اپنی حالت کا اظہار کرتی ہے کہ کسی طرح ایسے کل نہیں مل سکتی:

روئیے تو سب روتے ہیں گھر کے — رونے نہیں دیتے جی بھر کے
ہنسیے تو ہنسنا عیب ہے ہم کو — کیونکہ الٰہی کاٹیے غم کو
سوچ میں میری سارا گھر ہے — میرے چلن پر سب کی نظر ہے
آپ کو ہوں ہر وقت مٹاتی — پہنتی اچھا میں ہوں نہ کھاتی

جانتی ہوں نادرک ہے زمانا   بات ہے اک یاں عیب لگانا
آپ کو یاں تک میں نے مٹایا   پر دنیا کو صبر نہ آیا
مل جاؤں گر خاک میں بھی میں   بچ نہ سکوں طعنوں سے کبھی میں
اے بے آسوں کے رکھوالا   اے ڈوبے بیڑے کے کھیوا
اب تیرے کی ترائی تیری   ڈوبی ناؤ ، دہائی تیری

اور اپنے رب سے اپنا کہتے کہتے وہ شکایت کے لہجے میں کہتی ہے :—

ڈر دوزخ کا پھر آگے کیا ہے ؟   جس نے رنڈاپا جھیل لیا ہے ؟

ہمارے یہاں رانڈ عورت کی زندگی دوزخ سے بدتر ہوتی ہے یہ بات کس سے چھپی ہے — کیسی بھیانک مگر سچی تصویر کھینچی ہے ان دو مصرعوں میں بیوگی کی اپنی مصیبت سناتے سناتے وہ اشارے کناؤں میں دل کا حال اور اپنی جیسی دوسری بہنوں کی حالت زار کی طرف بھی اشارہ کرتی ہے !—

اپنے لئے کچھ کہہ نہیں سکتی   پر یہ سہے بن رہ نہیں سکتی
میں ہی اکیلی نہیں ہوں دکھیا   پڑی ہے لاکھوں پر بھی بپتا
ہوگئیں آخر اسی الم میں   کاٹ گئیں عمریں اسی غم میں
شرط سے پہلے بازی ہاری   بیاہ ہوا اور رہیں کنواری
کوئی نہیں جو غور کرے اب   نبض پہ ان کی ہاتھ دھرے اب
چوٹ نہ جن کے دل کو لگی ہو   وہ کیا جانیں دل کی لگی کو
بے دردوں سے پڑا ہے پالا   تو ہی ہے اب ان کا رکھوالا

کوئی کہاں تک اس نظم کا اقتباس دے۔ اس کا تو ہر ہر شعر ہمارے ہاں کی بیوہ عورت کی دکھ بھری زندگی کی تفسیر ہے۔ ساتھ ہی ڈھائی سو شعروں کی یہ نظم اپنی جگہ کمال شاعری کا ایک نادر نمونہ ہے جس کو حالی کے کلام میں مسدس کے بعد سب سے اونچا درجہ حاصل ہے اور حالی کی سیرت کی تین سب سے نمایاں خصوصیتیں (جن کا اول میں ہم نے ذکر کیا ہے) سادگی ، خلوص اور درد دل ، اس کے ہر ہر شعر سے ٹپک رہا ہے۔

حالی کی نظم و نثر کے مطالعے کے بعد بھی، اور ان کی سیرت کو پرکھنے پر بھی، ہمیں یہ حقیقت صاف نظر آجاتی ہے کہ حالی کے دل میں ہر حق دار کو اس کا حق دلوانے کی خواہش اور ہر مظلوم کی دادرسی کا جذبہ تھا اور اس میں عورت کا درجہ شاید سب سے بڑا ہے۔ ہماری زبان سے کبھی کبھار دوسرے شاعروں اور رہنماؤں نے بھی چلتے چلتے عورت کی عظمت یا اس کے حقوق کا ذکر کیا ہے، مگر حالی نے جس طرح اس کی حمایت کی، اور اس کی سچی عظمت اور اس کے بلند کردار، اس کی انسان دوستی اور اس کے خدمت و ایثار کو سراہا اور اس کے حقوق کے لیے جتنی زوردار آواز بلند کی کیا وہ کسی اور نے بھی کی ہے؟ میرا خیال ہے کہ میں بلا خوف تردید کہہ سکتی ہوں کہ نہیں۔

———:0:———

منظومات حالی

از عبادت بریلوی

حالی کی شخصیت میں رنگا رنگی کے باوجود ایک یکرنگی تھی۔ ان کے فکر کی جولانیاں اپنے لیے نئی نئی جولانگاہیں تلاش کرتی تھیں لیکن ان کا میدان ایک ہی رہتا تھا۔ ان کے خیال کی بلند پروازیاں اپنی پرواز کے لیے نئے سے نئے افق کی جستجو میں سرگرداں رہتی تھیں لیکن ان کا مقصد ایک ہی ہوتا تھا۔ حالی کی روح بے چین تھی لیکن اس بے چینی کو انھوں نے ایک جگہ مرکوز کر کے سکون سے ہم آغوش کردیا تھا۔ ان کی متنوع کیفیات اور جذبات و احساسات ایک ہی محور کے گرد گھومتے تھے۔ ان کے راستے مختلف تھے لیکن منزل ایک تھی زندگی بھر وہ ان راستوں پر چل کر اس منزل کی طرف بڑھنے کی کوشش کرتے رہے۔ اور اس سے ہمکنار ہونے کی سعادت انھیں نصیب بھی ہوگئی۔ حالی کی بڑائی اور ان کی شخصیت کی رنگا رنگی کا راز اسی یک رنگی میں مضمر ہے۔ نظریۂ حیات سے یہ والہانہ وابستگی، نصب العین سے یہ جنونانہ شیفتگی حالی کی شخصیت میں سب سے زیادہ نمایاں ہے۔ انھوں نے اپنی ساری صلاحیتوں کو اس کے لیے وقف کردیا۔ جو بات بھی کی اور جس انداز میں بھی کی، وہ سب اسی نظریۂ حیات، اسی نصب العین اور اسی مقصد کے لیے کی۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی رنگا رنگ شخصیت میں ایسی یک رنگی نظر آتی ہے، جس نے حالی کو صحیح معنوں میں حالی بنایا اور جس کی مثال کہیں اور مشکل ہی سے مل سکتی ہے۔

یہ بات ایسی کچھ عجیب نہیں ہے۔ حالی جس مزاج کے انسان تھے اور جن حالات کے سائے میں ان کے شعور کی نشو و نما ہوئی، ان کو سامنے رکھ کر اگر دیکھا جائے تو اس بات کا احساس ہوتا ہے کہ حالی کو اس صورت حال سے دوچار ہونا ہی چاہئے تھا۔ اور یہ خصوصیت

ان کی شخصیت میں پیدا ہوئی ضرور تھی۔ حالی نے جس گھرانے میں آنکھ کھولی وہاں شرافت تھی، لیکن اس شرافت کو عسرت اور مفلسی نے گھیر رکھا تھا۔ لیکن اس مفلسی نے کوئی ایسی صورت نہیں پیدا کی تھی جو عام طور پر انحطاط و زوال کے زمانے میں مختلف افراد میں پیدا ہوجاتی ہے۔ یعنی زندگی سے فرار اور ایسی چیزوں سے دلچسپی جو وقتی طور پر ان حالات کی تلخیوں کو نگاہوں سے اوجھل کرکے انہیں سکون بخش سکیں۔ حالی کے خاندان کی پشت‌پناہی پر مذہب اور اس کی اقدار تھیں۔ ان اقدار نے انہیں راہ راست سے نہیں ہٹنے دیا۔ چنانچہ حالی کی شخصیت پر مذہب کے اثرات بڑے گہرے اور ہمہ گیر نظر آتے ہیں۔ اس میں شبہ نہیں کہ اس صورت حال کو پیدا کرنے میں ان مختلف مذہبی تحریکوں کو بھی خاصا دخل ہے جو ان دنوں مولانا سید احمد بریلوی اور مولانا فضل حق خیرآبادی کے زیر اثر لوگوں کے دلوں میں گھر کر رہی تھیں اور جنہوں نے آپس کے اختلافات کے باوجود جہاں تک مذہب کے بنیادی اصولوں کا تعلق ہے، افراد کے اندر ایک گہرا شعور مذہب کی اقدار کا پیدا کردیا تھا۔ یہ شعور مذہب کے انفرادی پہلو ہی تک محدود نہیں تھا بلکہ اس نے اپنے اندر اجتماعیت کی شان پیدا کی تھی۔ مذہب کو قومی زاویۂ نظر سے دیکھنے اور برتنے کا رجحان عام ہونے لگا تھا۔ مسلمانوں کے زبوں حالی کے احساس نے اس رجحان کو کچھ اور بھی ہوا دی تھی۔ حالی کے خاندان کے افراد میں یہ احساس نظر آتا ہے اور خود حالی بھی اس سے متاثر ہوتے ہوئے معلوم ہوتے ہیں۔ ابتدا میں نجی حالات اور ذاتی الجھنیں انہیں اس سلسلے میں کسی عملی اقدام سے باز رکھتی ہیں۔ لیکن وقت کے ساتھ ساتھ ان کے شعور میں اس اعتبار سے پختگی آتی جاتی ہے اور وہ مسلمانوں کی حالت اور زندگی کی بدلتی ہوئی کیفیت کو شدت کے ساتھ محسوس کرنے لگتے ہیں۔ ابتدا میں عملی اقدام کی طرف حالی کی توجہ نہیں ہوئی کیونکہ اس کے لیے ابھی زمین تیار نہیں ہوئی تھی۔

اس صورت حال نے حالی کو اپنی زندگی کے ابتدائی زمانے میں بھی اگرچہ عملی کام کرنے سے باز رکھا لیکن انہیں ان حالات پر غور کرنے کا موقع دیا۔ چنانچہ علم کی پیاس ان کے اندر بڑھی۔ مطالعے کی آتش شوق ان کے اندر بھڑکی۔ مطالعے کی شوق نے غور و فکر میں اضافہ کیا اور غور و فکر نے مطالعے کے آتش شوق کو تیز سے تیزتر کردیا۔ حالی نے اس زمانے میں مذہبیات کے مطالعے کی طرف خاصی توجہ کی۔ اخلاق اور فلسفے کی طرف بھی وہ

راغب ہوئے۔ شعر و ادب کی سحرکاری سے بھی وہ متاثر ہوئے۔ اور جب علم کی پیاس انہیں پانی پت سے کھینچ کر دلی لے آئی تو غالب و شیفتہ کی صحبتوں نے ان کے اس شعری و ادبی ذوق کو ایسا نکھارا کہ اسے چار چاند لگ گئے۔ اور شعر و ادب کے اس صحیح ذوق نے انہیں کچھ اور بھی حساس بنادیا وہ کچھ اور بھی باشعور ہوگئے۔ زندگی اور اس کے مختلف پہلوؤں پر ان کی نظر کچھ اور بھی گہری پڑنے لگی۔

حالی کی زندگی کی رفتار ہی کچھ ایسی تھی کہ ابتدا ہی سے وہ حد درجہ حساس تھے۔ اور انسانی زندگی کے ہر پہلو کو اسی احساس کی شدت کے ساتھ دیکھا کرتے تھے۔ حالی کی شخصیت میں اس شدت احساس کو پیدا کرنے میں ان کی یتیمی کو بھی دخل ہے۔ بچپن ہی میں باپ کا سایہ ان کے سر سے اٹھ گیا تھا۔ ماں کی محبت بھی انہیں زیادہ عرصے تک نصیب نہیں ہوسکی تھی۔ پھر سترہ سال کی عمر میں ان کی شادی نے بھی ان کی شخصیت میں شدت احساس کا رنگ بھرا۔ حالی کی زندگی میں بندشیں اتنی سخت نظر آتی ہیں کہ انہیں کسی طرح بھی ان سے مفر نہیں تھی۔ نتیجہ یہ ہے کہ زندگی کے اس شکنجے میں حالات انہیں کستے رہے۔ اور وہ وقت کے ساتھ ساتھ زیادہ حساس اور جذباتی ہوتے گئے۔ لیکن یہ احساس کی شدت اور جذبات کی فراوانی نری جذباتیت ہوکر نہیں رہ گئی، بلکہ حالی کے شعور کی فراوانی نے اس کو عقل سے ہم آہنگ کیا۔ اور انہوں نے انفرادیت کے دائرے سے نکل کر انسانی زندگی کے مختلف پہلوؤں کو اجتماعی زاویۂ نظر سے دیکھنے کی کوشش کی۔

(۲)

دلی کا قیام حالی کی زندگی میں بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ دلی میں آکر حالی نے زندگی کی ساری وسعت اور رنگا رنگی کو دیکھا۔ یہاں انہیں انفرادیت کے دائرے سے نکل کر اجتماعیت سے روشناس ہونے کا موقع ملا۔ زندگی کے سیاسی، سماجی، معاشی، علمی، تعلیمی اور ادبی پہلوؤں سے وہ آشنا ہوئے— اور نہ صرف آشنا ہوئے بلکہ اس زمانے کی زندگی جن مسائل سے دوچار ہورہی تھی۔ حادثات کی جو موج خوں اس کے سر سے گزر رہی تھی اس سے حالی بھی اپنا دامن نہ بچا سکے۔ اور انہیں بھی اس کے ساتھ ہی بہہ جانا پڑا۔ غدر کا حادثہ ان کی آنکھوں کے سامنے واقع ہوا اور انہوں نے غدر کے ساتھ ایک تہذیب۔ ایک نظام

اور ایک معاشرت کو دم توڑتے ہوئے دیکھا ۔ لیکن اس کے ساتھ ہی زندگی کے افق پر ایک نئی دنیا ۔ ایک نئی تہذیب اور ایک نئی معاشرت کا آفتاب بھی طلوع ہوتا ہوا نظر آیا ۔ گویا حالی کی آنکھوں نے دو دنیائیں دیکھیں۔ دو دنیاؤں کے مد و جز اور نشیب و فراز کی ساری کیفیت ان کی آنکھوں کے سامنے رہی اور اس صورت حال نے انہیں اس درجہ متاثر کیا کہ وہ اسی میں کھو گئے ۔

یہ اجمال کسی قدر تفصیل چاہتا ہے :

انیسویں صدی کے وسط کی دلی اس کشمکش کی پوری طرح نمائندگی کرتی ہے۔ جو ان دنوں ہندوستان کی زندگی میں عموماً اور ہندوستانی مسلمانوں کی زندگی میں خصوصاً جاری و ساری تھی ۔ اورنگ زیب کے بعد مغلیہ سلطنت میں انحطاط و زوال کا جو دور دورہ شروع ہوا تھا وہ اب اپنے شباب پر پہنچ گیا تھا ۔ مغلوں کی حکومت بس اب نام کی حکومت رہ گئی تھی، ورنہ قلعے کے باہر سکہ انگریزوں کا چلتا تھا ۔ مغلوں کی حکومت صرف لال قلعے کے اندر محدود تھی ۔ لیکن دن بدن اس کا حال بد سے بدتر ہوتا جاتا تھا ۔ ہر طرف افراتفری تھی ۔ ایک بحرانی کیفیت تھی ۔ مسلمان خاص طور پر اس افرا تفری اور بحران کا شکار تھے ۔ مغلوں کی حکومت سے انہیں ایک جذباتی وابستگی تھی ۔ حالانکہ معاشی اعتبار سے اس کا عدم وجود ان کے لیے برابر تھا کیونکہ بہرحال اس حکومت کی بنیادیں جاگیردارانہ نظام کی بنیادوں پر استوار تھیں ۔ لیکن مسلمانوں کی ذہنی کیفیت کچھ ایسی تھی کہ وہ مغلوں کے سامنے کسی اور نظام حکومت کے قبول کرنے کے لیے تیار نہیں تھے ۔ غدر کا واقعہ ایک حد تک اس صورت حال کا نتیجہ بھی تھا ۔ بہر حال غدر سے قبل مسلمانوں نے ذہنی طور پر انگریزوں کے تسلط کو قبول نہیں کیا تھا ، اور وہ بہادر شاہ ہی کو اپنا مداوا سمجھتے تھے ۔ مسلمانوں کی اس ذہنی کیفیت نے انہیں کہیں کا نہیں رکھا اور وہ معاشی و معاشرتی اعتبار سے پستی میں گرتے گئے ۔ کیونکہ زندگی میں انحطاط و زوال کی خصوصیت کے رونما ہونے کی وجہ سے معیار باقی نہیں رہ گئے تھے زندگی کی بنیادی قدروں میں تزلزل پیدا ہوگیا تھا ۔ یہی وجہ ہے کہ مسلمانوں نے اپنی اہمیت کھودی تھی ۔ تھوڑا بہت علمی و ادبی چرچا مسلمانوں میں ضرور باقی تھا ۔ لیکن یہ بھی ایک حد تک سیاسی اعتبار سے اس سکون کا نتیجہ تھا جو انگریزوں کی طاقت کے ہاتھوں

وجود میں آیا تھا۔ اگر یہ صورت نہ ہوتی تو غدر سے قبل اتنے اہل کمال دلی میں جمع نہ ہوتے۔

سات سمندر پار سے آئے ہوئے انگریزوں نے ایک حد تک اس افراتفری کو ضرور ختم کیا جو سلطنت مغلیہ کے زوال و انحطاط کی وجہ سے اس زمانے کے ہندوستان کی زندگی میں پیدا ہوگئی تھی۔ لیکن مسلمانوں نے چونکہ ذہنی طور پر ان تبدیلیوں کو قبول کرنے سے گریز کیا۔ اس لیے ان کی زندگی میں غدر سے قبل کوئی ایسی نمایاں تبدیلی نہیں ہوئی جس سے ان کی زندگی کوئی نئی صورت اختیار کرتی۔ انگریزوں کے ساتھ جو نظام آیا وہ بھی مغلیہ دور کے جاگیردارانہ نظام سے ایسا کچھ مختلف نہیں تھا۔ یہ ایک نئے قسم کے جاگیرداری کی ابتدا تھی۔ نرچ کھسوٹ اور لوٹ مار کا وہی عالم تھا۔ پھر مسلمانوں نے چونکہ اس نظام کو جلد قبول نہیں کیا اس لیے وہ معاشی اعتبار سے کچھ اکھڑے اکھڑے سے رہے۔ چنانچہ معاشی اعتبار سے مسلمانوں کی حالت جیسے جیسے وقت گزرتا گیا بد سے بدتر ہوتی گئی۔ معاشی بدحالی معاشرتی اعتبار سے بھی پستی کی طرف لے جاتی ہے۔ اس لیے مسلمان معاشرتی اعتبار سے بھی قعر مذلت میں گرتے گئے۔ انہیں حالات نے کہیں کا نہیں رکھا۔

غدر کھوئی ہوئی طاقت کو ایک بار پھر حاصل کرنے کی ایک ناکام کوشش تھی۔ انگریزوں کے خلاف یہ بغاوت کسی مضبوط بنیادوں پر استوار نہیں تھی۔ ایک جذباتی نعرے نے لوگوں کو ایک مرکز پر جمع ضرور کردیا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ اس میں مسلمانوں کو خاطر خواہ کامیابی نصیب نہ ہوئی اور سارا خمیازہ انہیں کو بھگتنا پڑا۔ غدر میں ناکامی کے بعد مسلمان کہیں کے نہ رہے۔ ان کی رہی سہی قوت بھی ختم ہوگئی۔ ظلم و ستم کے وہ پہاڑ ان پر ٹوٹے کہ انہوں نے سب کچھ بھلا دیا۔ معاشی و معاشرتی حالت کچھ اور بھی خراب ہوگئی۔ یہ مسلمانوں پر بڑا نازک وقت تھا۔ انگریز صرف انہیں کو اپنا دشمن سمجھتے تھے۔ برادران وطن کو ان سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ اس وقت مسلمان ہر اعتبار سے تہی‌دست تھے۔ حالات نے انہیں ایسی گھٹا ٹوپ اندھیاریوں میں پابہ زنجیر کردیا تھا کہ راستے کی صورت انہیں نظر ہی نہیں آتی تھی۔ اس وقت ازسرنو زندگی شروع کرنے کے لیے صرف دو ہی صورتیں ان کے سامنے تھیں۔ یا تو وہ اپنی کھوئے ہوئے اقتدار کو حاصل کرنے کے لیے ایک دفعہ پھر انگریزوں کے

مقابلے میں صف آرا ہوتے یا پھر نئے حالات سے مطابقت پیدا کرلیتے۔ غدر نے ان کی حالت کو اس درجہ تباہ کردیا تھا کہ ان کی کمر ہر اعتبار سے ٹوٹ چکی تھی۔ اس لیے لڑنے کا تو اب سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ چنانچہ وہ نئے حالات سے مطابقت پیدا کرنے کے لیے مجبور ہوگئے کیونکہ ایسا نہ کرنے میں ان کی موت تھی۔

سرسید کی تحریک کو اسی صورت حال نے جنم دیا۔ یہ تحریک اگرچہ ابتدا میں تعلیمی تھی لیکن وقت کے ساتھ ساتھ اس نے ہندوستانی مسلمانوں کی زندگی کے عام پہلوؤں کو اپنے دامن میں سمیٹ لیا۔ اس کی نوعیت سیاسی بھی ہوگئی، معاشی اور معاشرتی بھی ہوگئی۔ اور اس نے ایسے مسلمانوں کو ایک راہ دکھائی جو غدر کے بعد بے یار و مددگار ہوکر اندھیاریوں میں بھٹک رہے تھے۔ چنانچہ سرسید نے مسلمانوں کی زندگی میں سیاسی، معاشی اور معاشرتی اعتبار سے اصلاح کرنے کی کوشش کی۔ انھوں نے ماضی کی روشنی میں حال کا جائزہ لیا اور مستقبل کے لیے نئے راستے تعمیر کیے۔ انھوں نے مذہب کو خیرباد نہیں کہا۔ بلکہ مذہب کو عقل سے ہم آہنگ کرنے کی کوشش کی۔ مذہب کے غلط تصورات جو زندگی کے لیے وبال بن گئے تھے انہیں از سر نو راہ راست پر لانے اور مذہب کے صحیح تصورات کو پیش کیا۔ مذہب نے ماضی میں جو روایات قائم کی تھیں ان کو انھوں نے ترقی کی راہ میں آگے بڑھنے کے لیے ضروری قرار دیا۔ یہی وجہ ہے کہ سر سید کی تحریک میں مذہب کو بھی ایک بنیادی حیثیت حاصل ہے۔ البتہ اس مذہب کے اصولوں کو انھوں نے عملی بنانے کی کوشش کی ہے۔ مذہب کے علاوہ مسلمانوں کی زندگی میں انحطاط و زوال کے ماحول میں زندگی بسر کرنے کے باعث معاشرتی اعتبار سے جن مذموات نے گھر کرلیا تھا، سرسید کی تحریک نے ان کو ختم کرنے کی کوشش کی۔ غلط روایات کو خیرباد کہا۔ معاشرے میں عورت کی حیثیت کو متعین کیا۔ لایعنی رسموں کو ختم کرنے کے منصوبے باندھے اور ایک صحت مند اور صحت بخش زندگی بسر کرنے کی طرف توجہ دلائی۔ ادب جو برسوں سے صرف تفریح طبع کا ذریعہ سمجھا جاتا تھا اس کو افادیت کے تصورات سے آشنا کیا اور ملک و قوم کی تعمیر میں اس سے کام لینے کی ایک فضا پیدا کی۔

یہ باتیں سرسید کی تحریک میں بنیادی حیثیت رکھتی ہیں۔ سرسید حالات کے بڑے

اچھے نباض تھے۔ انہوں نے مسلمانوں کی حالت کو بخوبی دیکھا اور سمجھا تھا اور ان کی تحریک نے اسی حالت کو سامنے رکھ کر زندگی کے لیے چند اصول بنائے تھے۔ ان اصولوں کا خیال اس وقت کی زندگی کے لیے ضروری تھا۔ مسلمانوں کی زندگی غدر کے بعد ایک ایسے موڑ پر آگئی تھی جہاں اس راہ کو اختیار کرنے کے سوا اور کوئی چارہ ہی نہیں تھا۔ نئے نظام نے مسلمانوں کا جو متوسط طبقہ پیدا کیا تھا، اسے روٹی کی ضرورت تھی، روٹی کے لیے معاش کی ضرورت تھی، معاش کے حصول کے لیے تعلیم کی ضرورت تھی۔ زندگی کو معاشرتی اعتبار سے ایک نئے سانچے میں ڈھالے بغیر ایسا ممکن نہیں تھا۔ نظریۂ حیات میں تبدیلی کے بغیر اس راہ میں کامیابی نصیب ہو ہی نہیں سکتی تھی۔ اس لیے سرسید نے جو کچھ کیا وہ سب حالات و واقعات کا تقاضا تھا۔ اور یہی وجہ ہے کہ اس وقت کی ساری زندگی اسی رنگ میں رنگ گئی۔

(۳)

حالی نے یہ تمام حالات دیکھے۔ انہیں حالات کے سائے میں ان کے شعور کی نشو و نما ہوئی۔ ان کی شخصیت کو انہیں حالات نے بنایا۔ انہیں حالات نے ان کے فن کو سنوارا۔ بلکہ یہ کہنا بےجا نہیں کہ حالی انہیں حالات اور اسی ماحول کے پیداوار تھے۔ ان حالات نے انہیں پیدا کیا اور ان کے ہاتھوں یہ حالات پیدا ہوئے۔ حالی سرسید کے دست راست تھے۔ سرسید کا ان پر گہرا اثر تھا۔ سر سید جو کچھ سوچتے تھے حالی اسے نہ صرف عوام تک پہنچاتے تھے بلکہ ان کے دلوں میں اتار دیتے تھے۔ سر سید اور ان کی تحریک نے حالی کو قومی شاعر بنایا اور حالی نے سر سید کے خیالات کو اپنی شاعری کا موضوع بنا کر گھر گھر پہنچادیا۔

سر سید کے زیر اثر آنے سے قبل حالی پر قدیم شاعری کا رنگ چڑھا ہوا تھا۔ یہ ٹھیک ہے کہ ان کے شعور اور نکھرے ہوئے مذاق نے اس میں ایک نیا رنگ دینے کی کوشش کی تھی لیکن قومی شعور اور افادی پہلو اس میں نہ ہونے کے برابر تھا۔ لیکن بدلتے ہوئے حالات نے حالی کو قدیم شاعری سے بدظن کیا اور سر سید کی تحریک پر انہوں نے باقاعدہ قومی شاعری کی طرف توجہ کی۔ حالی نے خود اس کا اعتراف کیا ہے۔ لکھتے ہیں :-

" زمانے کا نیا ٹھاٹ دیکھ کر پرانی شاعری سے دل سیر ہو گیا تھا اور جھوٹے ڈھکوسلے باندھنے سے شرم آنے لگی تھی ..... قوم کے ایک سچے

خیرخواہ نے آکر ملامت کی اور غیرت دلائی کہ حیوان ناطق ہونے کا دعویٰ کرنا اور خدا کی دی ہوئی زبان سے کچھ کام نہ لینا بڑے شرم کی بات ہے ..... عزیز ذلیل ہوگئے ۔ شریف خاک میں مل گئے ۔ علم کا خاتمہ ہوچکا ہے۔ دین کا صرف نام باقی ہے۔ افلاس کی گھر گھر پکار ہے۔ پیٹ کی چاروں طرف دھائی ہے۔ اخلاق بگڑگئے ہیں اور بگڑتے جاتے ہیں۔ تعصب کی گھنگھور گھٹا تمام قوم پر چھائی ہے ...... ایسے میں جس سے جو کچھ بن آئے سو بہتر ہے، ورنہ ہم سب ایک ہی ناؤ میں سوار ہیں اور ساری ناؤ کی سلامتی ہماری سلامتی ہے۔ ہر چند لوگ بہت کچھ لکھ رہے ہیں اور لکھ چکے ہیں، مگر نظم جو بالطبع سب کو مرغوب ہے اور خاص کر عرب کا ترکہ اور مسلمانوں کا موروثی حصہ ہے۔ قوم کے بیدار کرنے کے لیے اب تک کسی نے نہیں لکھی "۔

اس طرح سر سید کے کہنے پر حالی نے غزل کو چھوڑ کر نظم کی طرف توجہ کی اور شاعری میں افادیت کا رنگ بھرا اور اس کے بعد انہوں نے اپنی تمام صلاحیتیں قومی شاعری کے لیے وقف کردیں ۔ قومی شاعری کے لیے موضوع کی مناسبت سے انہوں نے نئے نئے سانچے بھی تیار کیے ۔ اور اس طرح حالی کی شاعری منظومات کی نئی تکنک سے آشنا ہوئی ۔ مسدس ، مخمس ، مربع ، ترکیب بند ، ترجیع بند ، مثنوی ۔ غرض کہ حالی نے ان سب کو اپنایا اور اپنے خیالات انہی کے ذریعے سے قوم تک پہنچائے۔

حالی کی شاعری میں نظموں کی اس نئی تکنک کے تجربات ایسے کچھ نئے نہیں تھے ۔ حالی لاہور کے دوران قیام میں مولانا محمد حسین آزاد کی فرمائش پر کرنل ھالرائڈ اور میجر فلر کے زیر اثر انجمن پنجاب کے مشاعروں کے لیے چند نظمیں لکھ چکے تھے ۔ یہ نظمیں اچھی ضرور تھیں لیکن ان میں قومی شعور اتنا گہرا اور رچا ہوا نظر نہیں آتا جتنا سرسید کی اس تحریک کے بعد سے آن کی نظموں میں پیدا ہوجاتا ہے۔

بے شک پھر بھی وہ دوسرے اعتبار سے دلچسپ ہیں۔ ان کے موضوعات عمومی نوعیت کے ہیں۔ اور حالی کی شخصیت ان میں بھی پوری طرح بے نقاب ہے ۔ حالی کے دل میں حب وطن کا جو جذبہ تھا اس کے اثرات بھی اس دور کی نظموں میں ملتے ہیں۔ اور حب وطن کا یہ انفرادی جذبہ کہیں کہیں اجتماعیت میں تبدیل ہوتا ہوا نظر آتا ہے ۔ حالی اس دور میں امید کی خوشی

اور اس کی اہمیت پر بھی روشنی ڈالتے ہیں۔ مناظر فطرت سے بھی متاثر ہوتے ہیں۔ بعض اخلاقی موضوعات پر بھی طبع آزمائی کرتے ہیں۔ لیکن اس دور کی نظموں میں کوئی بہت واضح نقطۂ نظر اور کوئی گہرا اجتماعی شعور کم ملتا ہے۔ ان کے موضوعات میں وہ بات نہیں جو سرسید کی تحریک کے بعد ان کی نظموں میں پیدا ہوتی ہے۔ سرسید کی تحریک کے زیر اثر آنے کے بعد حالی نے جو نظمیں لکھی ہیں ان میں نسبتاً احساس کی زیادہ شدت اور شعور کی زیادہ گہرائی ہے۔ ان میں اجتماعی نقطۂ نظر اور قومی شعور زیادہ واضح ہے۔ افادیت کی تو ان میں ایک لہر سی دوڑی ہوئی نظر آتی ہے۔

سرسید کی تحریک کے زیر اثر جو نظمیں حالی نے لکھی ہیں ان کے عام موضوعات وہی ہیں جن کی طرف سرسید نے توجہ کی تھی۔ ان میں ماضی کی روایات کا احساس بہت شدید ہے۔ ان میں مسلمانوں کے گذشتہ کارناموں کا ذکر بار بار آتا ہے۔ مٹی ہوئی عظمتوں کی کہانیاں بار بار دھرائی جاتی ہیں۔ اسلامی تاریخ کے زریں ادوار کی بنیادی خصوصیات کو بار بار پیش کیا جاتا ہے۔ اور حالی ان سب کی یاد اس لیے تازہ کرتے ہیں کہ وہ قوم کے لیے شمع راہ ثابت ہوں۔ اور قوم ترقی کی منزلوں پر گام زن ہوسکے۔ حالی کی ان نظموں میں مسلمانوں کی زبوں حالی کے نقشے بھی ملتے ہیں۔ اور اس زبوں حالی کو دور کرنے کا ایک پیام بھی نظر آتا ہے۔ حالی نے اپنی نظموں میں مذہب کے صحیح تصورات کو ذہن نشین کرنے کی کوشش کی ہے۔ انھوں نے مذہب کو عقل سے ہم آہنگ کرنے کا سبق پڑھایا ہے۔ دنیاوی زندگی میں مذہب کی جو اہمیت ہے اس کی طرف بھی توجہ دلائی ہے۔ ان نظموں میں معاشرتی زندگی کو بہتر بنانے کا احساس بھی موجود ہے۔ اصلاح کی خواہش بھی ان میں چھپی ہوئی ہے۔ ارتقا کا جذبہ بھی ان میں کارفرما ہے۔ اخلاقی اقدار کی اہمیت بھی ان نظموں میں نمایاں ہے۔ علمی اور تعلیمی معاملات کا تذکرہ بھی ان میں ملتا ہے۔ عورتوں کی بے بسی اور کس مپرسی پر آنسو بھی بہائے جاتے ہیں۔ اور ان کی زندگی کو بہتر بنانے کے لیے ایک لائحہ عمل بھی پیش کیا جاتا ہے۔ غرض یہ کہ اس زمانے کی زندگی میں جتنے بھی موضوعات تھے، ان سب کی ترجمانی کسی نہ کسی صورت سے حالی نے اپنی ان منظومات میں ضرور کی ہے۔

یہ ٹھیک ہے کہ حالی کی ان نظموں کے موضوعات عصری نوعیت کے ہیں۔ لیکن ان

کی بڑائی کا راز اسی میں مضمر ہے۔ حالی کے دور کی تمام خصوصیات اُن میں بے نقاب ہیں۔ اس زمانے کی حالت، غور و فکر کا انداز، خیالات و تصورات، ذہنی و جذباتی رجحانات، سب کچھ ان کے اندر موجود ہے۔ اور جگہ جگہ آفاقی نوعیت کے موضوعات کی ترجمانی بھی ان نظموں میں مل جاتی ہے۔

(۴)

منظومات حالی کے تفصیلی مطالعے کے سلسلے میں سب سے پہلے جس چیز پر نظر پڑتی ہے، وہ یہ ہے کہ حالی کی نظم نگاری کی ابتدا اثرات مغرب کے زیرسایہ لاہور میں ہوئی۔ حالی بسلسلۂ ملازمت سنہ ۱۸۷۴ع میں لاہور آئے۔ اس سے قبل وہ تقریباً آٹھ سال تک نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ کے ساتھ رہ چکے تھے۔ اور شیفتہ کی صحبت سے انھیں بڑا فائدہ ہوا تھا۔ ان کے ذوق کو سنوارنے میں شیفتہ کا بڑا حصہ ہے۔ خود حالی نے لکھا ہے کہ "در حقیقت میرزا کے مشورے اور اصلاح سے مجھے چنداں فائدہ نہیں ہوا جو نواب صاحب مرحوم کی صحبت سے ہوا۔ وہ مبالغے کو ناپسند کرتے تھے۔ اور حقائق و واقعات کے بیان میں لطف پیدا کرنا اور سیدھی سادی اور سچی باتوں کو محض حسن بیان سے دلفریب بنانا اسی کو انتہائے کمال شاعری سمجھتے تھے۔ چھچھورے اور بازاری الفاظ و محاورات اور عامیانہ خیالات سے شیفتہ اور غالب دونوں متنفر تھے"۔ حالی کا یہ اعتراف اس بات کو ظاہر کرتا ہے کہ غالب اور شیفتہ کی صحبتوں نے ان کے سامنے شعر و شاعری کی صحیح اقدار کو پیش کیا تھا۔ اور شاعری کا معیار وہ سمجھتے تھے کہ اسے اصل کے مطابق ہونا چاہیے۔ اس کی بنیادیں حقائق پر استوار ہونا ضروری ہیں۔ اگر اس کی بنیاد مبالغہ اور دور ازکار باتوں پر استوار ہوتی ہے تو وہ کسی کام کی نہیں رہتی اور تاثر کی کیفیت اس سے مفقود ہوجاتی ہے۔

یہ شعور لے کر حالی لاہور پہنچے۔ یہاں حالی کو ایک ایسا ماحول ملا جس نے ان کے شعور پر کچھ اور بھی جلا کی۔ یہاں وہ مغرب کے زیر اثر آئے۔ ہر چند مغرب کے یہ اثرات ایسے گہرے نہیں تھے۔ کیونکہ حالی کو انگریزی زبان پر عبور نہیں تھا۔ پھر بھی کرنل ہالرائڈ کی علم دوستی اور ادب نوازی کے باعث ایسے حالات پیدا ہوگئے تھے جن کا اثر ہونا لازمی تھا۔ پھر جو خدمت حالی کے سپرد ہوئی تھی اس نے بھی انھیں مغربی ادبیات

سے روشناس کیا - اور اس کی بنیادی خصوصیات سے وہ آشنا ہوگئے - اس وقت تک مغربی ادبیات اور افکار و خیالات سے دلچسپی لینے اور استفادہ کرنے کی ایک فضا پیدا ہوچکی تھی - سرسید سنہ ۱۸۷۲ء میں اپنا رسالہ "تہذیب الاخلاق" نکال چکے تھے جس کے سبب سے بقول حالی "مسلمانوں کے خیالات میں جو لٹریچر کا صحیح مذاق رکھتے تھے بہت جلد ایک انقلاب عظیم پیدا ہوگیا - اردو فارسی انشاپردازی کا قدیم طریقہ ان کی نظر میں نہایت سخیف اور سبک معلوم ہونے لگا - اور اپنی شاعری کو وہ حقارت کی نگاہ سے دیکھنے لگے" - بہرحال حالی اس وقت مغرب سے متاثر ہوئے اور اس تحریک میں شریک ہوگئے جو مغرب کے زیر اثر مولانا محمد حسین آزاد کے ہاتھوں کرنل ہالرائڈ کے ایما پر شروع ہوئی تھی - اور جو مشاعرہ انجمن پنجاب کے زیر اہتمام قائم ہوا تھا اس کے لیے انہوں نے چار نظمیں بھی لکھی تھی - یہ ان کی ابتدائی نظمیں تھیں -

حالی نے ان نظموں کی شان نزول کے بارے میں لکھا ہے :-

"سنہ ۱۸۷۴ء میں جب کہ راقم پنجاب گورنمنٹ بک ڈپو سے متعلق تھا اور لاہور میں مقیم تھا مولوی محمد حسین آزاد کی تحریک اور کرنل ہالرائڈ ڈائرکٹر سررشتۂ تعلیم پنجاب کی تائید سے انجمن پنجاب نے ایک مشاعرہ قائم کیا تھا جو ہر مہینے میں ایک بار انجمن کے مکان میں منعقد ہوتا تھا۔ اس مشاعرہ کا مقصد یہ تھا کہ ایشیائی شاعری جو کہ در و بست عشق اور مبالغہ کی جاگیر ہوگئی ہے اس کو جہاں تک ممکن ہو وسعت دی جائے اور اس کی بنیاد حقائق و واقعات پر رکھی جائے . . . جدت پسند طبقوں پر جس قدر مغربی انشاپردازی کی لے اب تک کھلی تھی وہی ان کو لے اڑی۔ بہت سے موزوں طبع اور بعضے کہن مشق بھی جن پر قدیم شاعری کا رنگ چڑھ چکا تھا اس مشاعرہ میں شریک ہونے لگے - اگرچہ صحبت مدت تک جمی رہی لیکن راقم صرف چار جلسوں میں شریک ہونے پایا تھا کہ بسبب ناموافقت آب و ہوا کے لاہور سے تبدیل ہوکر دلی چلا آیا۔ مجھے مغربی شاعری کے اصول سے نہ اس وقت کچھ آگاہی تھی اور نہ اب ہے - نیز میرے نزدیک مغربی شاعری کا پورا پورا تتبع ایک ایسی نامکمل زبان میں جیسی کہ اردو ہے ، ہو بھی نہیں سکتا - البتہ کچھ تو میری طبیعت مبالغہ اور

اغراق سے بالطبع نفور تھی اور کچھ اس نئے چرچے نے اس نفرت کو زیادہ مستحکم کردیا ۔ اس بات کے سوا میرے کلام میں کوئی چیز ایسی نہیں ہے جس سے انگریزی شاعری کے تتبع کا دعویٰ کیا جاسکے ۔ یا اپنے قدیم طریقے کے ترک کرنے کا الزام عاید ہو ،،۔

اس بیان سے یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ حالی نے یہ نظمیں ایک بدلتے ہوئے ماحول کے تقاضے کو پورا کرنے کے لیے ایک مخصوص اصلاحی تحریک کے زیر اثر لکھی ہیں۔ ان نظموں میں مغرب کا گہرا اور براہ راست اثر نہیں ہے لیکن بالواسطہ طور پر وہ مغرب کے زیر اثر ضرور لکھی گئی ہیں ۔ اور ان میں موضوع اور انداز بیان دونوں اعتبار سے ایک جدت نظر آتی ہے ۔

یہ نظمیں تعداد میں صرف چار ہیں۔ لیکن ان میں سے ہر ایک جدید رجحانات کی ترجمانی کرتی ہے۔ ان کے موضوعات مختلف ہیں لیکن جدت کی خصوصیات ان سب میں مشترک ہیں ۔ اور یہی وجہ ہے کہ انہوں نے اردو نظم نگاری کو ایک نئے راستے پر ڈالا ہے۔ اس کو ایک نئی دنیا سے روشناس کیا ہے۔ جو اردو شاعری میں ایک نئے باب کا افتتاح ہیں۔

(٥)

اس سلسلے کی سب سے پہلی نظم ''برکھا رت،، ہے۔ اس نظم میں حالی نے برسات کی مختلف کیفیات کا ذکر کیا ہے۔ ابتدا میں برسات سے قبل گرمی کی جو شدت ہوتی ہے اس کی حالت بیان کی ہے اور گرمی کی ساری جزئیات کا تذکرہ کیا ہے۔ جانداروں کا تڑپنا ، کہساروں کا تپنا ، دریا کے پانی کا کھولنا ، جنگل میں گرمی کی شدت ، باغوں کی ویرانی ، جانوروں کی پریشانی، آندھیوں کی تندی ، لو کی شعلہ سامانی ، انسانوں کی بے چینی ، شہر کی کیفیت ، چھوٹے بچوں کی بے حالی ، ان سب کی تصویر حالی نے بڑی خوبی سے کھینچی ہے اس نظم میں یہ تصویریں بذات خود بھی اہمیت رکھتی ہیں اور اصل موضوع کے خد و خال کو ابھارنے اور نمایاں کرنے میں بھی ان کو خاصا دخل ہے۔ گرمی کے پس منظر کے بغیر برسات کی تصویر نمایاں نہیں ہوسکتی تھی۔ اس لیے حالی نے اس نظم کے ایک حصے میں گرمی کی کیفیت کا بیان اس قدر تفصیل سے کیا ہے۔ چنانچہ اس میں واقعہ نگاری منظرنگاری اور جزئیات نگاری کی خصوصیات پیدا ہوگئی ہیں ۔ چند اشعار سے اس کا اندازہ ہوتا ہے۔

گرمی سے تڑپ رہے تھے جاندار
اور دھوپ میں تپ رہے تھے کہسار
بھونل سے سوا تھا ریگ صحرا
اور کھول رہا تھا آب دریا
تھی لوٹ سی پڑ رہی چمن میں
اور آگ سی لگ رہی تھی بن میں
سانڈے تھے بلوں میں منہ چھپائے
اور ہانپ رہے تھے چار پائے

رستوں میں سوار اور پیدل
سب دھوپ کے ہاتھ سے تھے بیکل
گھوڑوں کے نہ آگے اٹھتے تھے پاؤں
ملتی تھی کہیں جو روکھ کی چھاؤں
تھی سب کی نگاہ سوئے افلاک
پانی کی جگہ برستی تھی خاک
پنکھے سے نکلتی جو ہوا تھی
وہ باد سموم سے سوا تھی

بازار پڑے تھے سارے سنسان
آتی تھی نظر نہ شکل انسان
چلتی تھی دکان جن کی دن رات
بیٹھے تھے وہ ہاتھ پر دھرے ہاتھ
خلقت کا ہجوم کچھ اگر تھا
یا پیاؤ پہ یا سبیل پر تھا

بچوں کا ہوا تھا حال بے حال
کملائے ہوئے تھے پھول سے گال
آنکھوں میں تھا ان کا پیاس سے دم
تھے پانی کو دیکھ کرتے ممم
ہر بار پکارتے تھے ماں کو
ہونٹوں پہ تھے پھیرتے زباں کو
پانی دیا گر کسی نے لاکر
پھر چھوڑتے تھے نہ منہ لگاکر

جزئیات نگاری کے ساتھ ساتھ ان اشعار میں مشاہدہ کی تیزی اور احساس کی شدت بھی اپنے شباب پر نظر آتی ہے۔

نظم کے دوسرے حصے میں حالی نے اس پس منظر میں برسات کی آمد کا ذکر کیا ہے اور پروا کی آمد، ابر کی کیفیت، بجلی کی چمک، گھنگھور گھٹاؤں کا عالم، باغوں کی ہریالی، درختوں کی شادابی، کوئل کی کوک، پپیہے کی پیہو، مور کی چنگھاڑ، انسانوں کی مسرت، اور اس مسرت سے سرشار ہوکر ان کی وارفتگی۔ ان سب کو حالی نے آنکھوں کے سامنے اس طرح

بے نقاب کردیا ہے کہ اس عالم کی ایک فضا تیار ہوجاتی ہے اور پڑھنے والا اس فضا میں اپنے آپ کو ڈھونڈھتا ہے :—

برسات کا بج رہا ہے ڈنکا — اک شور ہے آسمان پہ برپا
ہے ابر کی فوج آگے آگے — اور پیچھے ہیں دل کے دل ہوا کے
ہیں رنگ برنگ کے رسالے — گورے ہیں کہیں کہیں ہیں کالے
ہے چرخ پہ چھاونی سی چھائی — اک آتی ہے فوج ایک جاتی
جاتے ہیں مہم پہ کوئی جانے — ہمراہ ہیں لاکھ توپ خانے
توپوں کی ہے جب کہ باڑھ چلتی — چھاتی ہے زمین کی دہلتی

———

پھولوں سے پٹے ہوئے ہیں کہسار — دولہا سے بنے ہوئے ہیں اشجار
پانی سے بھرے ہوئے ہیں جل تھل — ہے گونج رہا تمام جنگل
کرتے ہیں پپیہے پیہو پیہو — اور مور پنگھاڑے ہیں ہرسو
کوئل کی ہے کوک جی لبھاتی — گویا کہ ہے دل میں بیٹھی جاتی

———

جاتا ہے کوئی ملار گاتا — ہے دیس میں کوئی گنگناتا
بھنگی ہیں نشے میں گاتے پھرتے — اور بانسریاں بجاتے پھرتے
سرون کوئی گا رہا ہے بیٹھا — چھیڑا ہے کسی نے ہیر رانجھا

ان اشعار میں صرف برسات کی کیفیت کا بیان ہی نہیں بلکہ احساس کی شدت نے اس میں ایک مخصوص جذباتی کیفیت پیدا کردی ہے۔ جس کی نوعیت انسانی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس حصے میں نفسیاتی حقیقت نگاری کا رنگ بہت نمایاں ہے۔ حالی اس حصے میں برسات کے عام مناظر کو ضرور پیش کرتے ہیں لیکن ساتھ ہی ساتھ ان مناظر کا جو فطری رد عمل عام انسانوں کے جذبات و احساسات پر ہوتا ہے اس کو خاص طور پر سامنے رکھتے ہیں۔ اس کی دلکشی کا راز اسی خصوصیت میں مضمر ہے۔

اس کے بعد حالی نے برسات کے موسم کی تعریف کی ہے۔ اور اس بات کو واضح کیا ہے کہ برسات کا موسم دنیا کو نئی زندگی بخشتا ہے۔ باغوں پر نکھار آجاتا ہے۔ کھیتیاں نہال ہوجاتیں ہیں۔ مور ناچنے لگتے ہیں۔ کوئل کوکنے لگتی ہے۔ ہواؤں میں مستی کا رنگ آجاتا ہے۔ دریا امنڈنے لگتے ہیں۔ زمین سونا اگلنے لگتی ہے۔ اور لوگوں کے دلوں میں امنگیں جاگ اٹھتی ہیں۔ باغوں میں جھولے پڑجاتے ہیں اور نوجوانی اٹھکھیلیاں کرنے لگتی ہے۔ نوجوان لڑکیوں کے جھولنا جھولنے کا منظر حالی نے کس خوبی سے پیش کیا ہے۔

کچھ باغوں میں جا بجا گڑے ہیں جھولے ہیں کہ سو بسو پڑے ہیں
کچھ لڑکیاں بالیاں ہیں کمسن جن کے ہیں یہ کھیل کود کے دن
ہیں پھول رہی خوشی سے ساری اور جھول رہی ہیں باری باری
جب گیت ہیں ساری مل کے گاتی جنگل کو ہیں سر پہ وہ اٹھاتی
اک سب کو کھڑی جھلا رہی ہے اک گرنے سے خوف کھا رہی ہے
ہے آن میں کوئی ملار گاتی اور دوسری پینگ ہے چڑھاتی
گاتی ہے کبھی کوئی ہنڈولا کہتی ہے کوئی "بدیسی ڈھولا"
اک جھولے سے وہ گری ہے جاکر سب ہنستی ہیں قہقہے لگاکر

زندگی کے انسانی پہلوؤں کا کتنا شدید احساس یہاں نظر آتا ہے۔ حالی روزمرہ کی زندگی کی عام باتوں کا کتنا گہرا شعور رکھتے تھے۔ حالی نے ان مناظر کی ایسی تصویرکشی کی ہے کہ ان سے قبل اس کی مثال سوائے نظیر اکبرآبادی کے اردو نظم میں کہیں اور نہیں مل سکتی۔ حالی کو منظرنگاری پر بڑی قدرت حاصل ہے اور یہ سب ان کے شدید احساس، گہرے شعور اور وسیع تجربے کا نتیجہ ہے۔

"برکھا رت" کو حالی نے ایک بڑے جذباتی انداز میں ختم کیا ہے۔ لیکن حالی کا یہ جذباتی انداز پوری طرح نفسیاتی ہے۔ حالی اس نظم میں جب اس بات کو پیش کرتے ہیں کہ برسات کے موسم میں وطن کی یاد زیادہ آتی ہے۔ برسات کی ہوا کے جھونکے اگرچہ اس کے دل کو فرحت اور روح کو تازگی بخشتے ہیں لیکن برسات کی یہ کیفیت اس کی آنکھوں کے سامنے ماضی کی رنگین اور دل موہ لینے والی یادوں کو سامنے لاکر کھڑا کردیتی ہے۔ اور اس کے دل

میں اشکوں کی لہریں اٹھنے لگتی ہیں۔ وہ بیکل اور بے چین ہوجاتا ہے۔ آنکھوں سے آنسوؤں کی جھڑی لگ جاتی ہے۔ کبھی گنگناتا ہے، کبھی جوش میں آ کے گانے لگتا ہے۔ اس گیت کا موضوع وطن کی صحبتوں کی یاد ہوتی ہے۔ اور اس کی فریاد دل میں نشتر کی طرح چبھنے لگتی ہے۔ اور سننے والے دل کو پکڑ کر رہ جاتے ہیں۔

ابر اتنے میں اک طرف سے اٹھا ۔۔۔ اور رنگ سا کچھ ہوا کا بدلا
برق آکے لگی تڑپنے ہردم ۔۔۔ اور پڑنے لگی پھوار کم کم
آنے جو لگے ہوا کے جھونکے ۔۔۔ تھے جتنے سفر کے رنج بھولے
سامان ملے جو دل لگی کے ۔۔۔ یاد آئے مزے کبھی کبھی کے
دیکھے کوئی اس گھڑی کا عالم ۔۔۔ وہ آنسوؤں کی جھڑی کا عالم
وہ آپ ہی آپ گنگنانا ۔۔۔ اور جوش میں آ کبھی یہ گانا

....

جب سبزہ و گل ہیں لہلہاتے ۔۔۔ صحبت کے مزے ہیں یاد آتے
ہم تم یونہی ہات میں دیے ہاتھ ۔۔۔ پھرتے تھے ہوائیں کھاتے دن رات
جب پیڑ سے آم ہے ٹپکتا ۔۔۔ میں تم کو ادھر ادھر ہوں تکتا
آخر نہیں پاتا جب کسی کو ۔۔۔ دیتا ہوں دعائیں نے کسی کو
رت آم کی آئے اور نہ ہوں یار ۔۔۔ جی اپنا ہے ایسی رت سے بیزار

اگرچہ حالی نے ان اشعار میں اپنی ذاتی ذہنی اور جذباتی کیفیت کا اظہار کیا ہے لیکن اس کی نوعیت آفاقی نظر آتی ہے۔ برسات کے موسم کو دیکھ کر غریب الوطن کے عالم میں حالی پر جو ذہنی و جذباتی کیفیت طاری ہوتی ہے، وہ ہر انسان پر طاری ہوسکتی ہے، بلکہ ہوتی ہے۔ حالی کی بڑائی اس میں ہے کہ انھوں نے اس کیفیت کے اظہار کو ایک آفاقی رنگ دیا ہے۔

حالی کی یہ پہلی نظم ہے لیکن اس میں وہ تمام خوبیاں موجود ہیں جو ایک اعلیٰ پائے کی نظم میں ہونی چاہئیں۔ اس کا موضوع نیا نہیں ہے لیکن اس کے باوجود اس میں ایک اچھوتا پن ہے۔ سوائے نظیر اکبرابادی کے حالی سے قبل اس موضوع پر کسی نے اس طرح طبع آزمائی نہیں کی۔ اس ملک کے رہنے والوں کی زندگی میں اس موضوع کی ایک جذباتی اہمیت ہے۔ حالی

نے اس جذباتی اہمیت کو اپنے پیش نظر رکھا ہے، لیکن اس کا عقلی عمل اور افادی پہلو بھی ان کی نظروں سے اوجھل نہیں ہوا ہے۔ انھوں نے اس نظم میں اس کی طرف بھی جگہ جگہ توجہ کی ہے۔ انسانی زندگی پر ذہنی اور جذباتی اعتبار سے موسموں کے جو اثرات ہوتے ہیں، حالی نے اس کے گہرے شعور کا اظہار اس نظم کے ذریعے سے کیا ہے۔ پھر منظر نگاری، واقع نگاری، جذبات نگاری، اور جزئیات نگاری کی حقیقت و واقعات سے بھرپور جو تقریریں انھوں نے اس نظم میں پیش کی ہیں، ان سے حالی کی فنی سلیقہ شعاری کا اندازہ ہوتا ہے۔

لاہور کے دوران قیام کی دوسری نظم "نشاط امید" ہے۔ اس کا موضوع ان کی پہلی نظم "برکھارت" سے مختلف ہے، لیکن اس کے باوجود تھوڑے سے فرق کے ساتھ موضوع کی نسبت سے، اس نظم میں بھی وہی خصوصیات پائی جاتی ہیں جو اس دور میں حالی کے فن میں نمایاں نہیں۔ اس میں بھی موضوع آفاقی نوعیت کا ہے۔ زندگی کی عام حقیقت اس میں بھی نمایاں ہوتی ہے۔ اور اس حقیقت کو پیش کرنے کے لیے حالی کہیں تاریخ کا سہارا لیتے ہیں۔ کہیں مذہب کا دامن پکڑتے ہیں۔ کہیں معاشرت سے کام لیتے ہیں، کہیں عمرانی اور تمدنی مسائل کے حوالے سے مطلب نکالتے ہیں۔ غرض کہ امید کی خوشی کی اہمیت کو حالی مختلف طریقوں سے ذہن نشین کراتے ہیں کہ اس کے تاثر میں اضافہ ہوجاتا ہے۔

"نشاط امید" کا موضوع پرانا ہونے کے باوجود نیا ہے۔ انسان جس وقت سے پیدا ہوا ہے امید اور اس کی خوشی اس کے دم کے ساتھ ہے۔ وہ ہمیشہ ہر حال میں اس کی رفیق اور دوست ثابت ہوتی ہے۔ مایوسیاں اور ناکامیاں اس کے دم سے گوارا بن جاتی ہیں۔ افلاس اور عسرت میں انسان اس کے سہارے غنی رہتا ہے۔ وہ دکھے ہوئے دلوں کا مداوا ہے۔ وہ ولولوں کو جگاتی اور حوصلوں کو بڑھاتی ہے۔ ارادوں میں اس کی وجہ سے نیا خون دوڑتا ہے۔ انسان کی بلندی کا راز امید ہی میں پوشیدہ ہے ـــــ اور نہ صرف دنیاوی معاملات میں، بلکہ دینی اور مذہبی، معلومات میں بھی امید کی کارفرمائی ہی نظر آتی ہے۔ اگر انسان کے دم کے ساتھ امید نہ رہے تو نیکیوں کی طرف بھی وہ توجہ نہیں کرسکتا۔ حق کی پرستش بھی امید کے بغیر ناممکن ہے۔ کبھی وہ حور بن کے دل کو لبھاتی ہے، اور کبھی شراب طہور کا جلوہ دکھاتی ہے۔ انسان امید ہی کے سہارے ان تک دوڑتا اور پہنچنے کی کوشش کرتا ہے۔ کبھی کبھی اس

امید کی نوعیت خیالی بھی ہوتی ہے۔ اور اس طرح بھی وہ گئے گزرے لوگوں کو زندہ رکھتی ہے۔ غرض یہ کہ دنیا کا سارا کارخانہ اسی امید کے دم سے چل رہا ہے۔

حالی نے اس نظم میں بڑی اہم حقیقتوں کے چہرے سے نقاب اٹھائی ہے اور ایک اہم نفسیاتی نکتے کو اپنا موضوع بنایا ہے۔ تقریباً ہر شعر میں انسانی زندگی کی ترجمانی گہرے شعور اور شدید احساس کے ساتھ ملتی ہے۔ حالی کا انداز اس نظم میں بیانیہ ہے لیکن اس بیانیہ رنگ میں انھوں نے اپنی نفسیاتی حقیقت نگاری سے ایک نئی جان ڈال دی ہے۔ خصوصاً جہاں انھوں نے نا اُمیدی اور اُمید کی کشمکش کا بیان کیا ہے وہاں تو ان کی یہ خصوصیت اپنے کمال پر نظر آتی ہے:—

ہوتا ہے تو میدیوں کا جب ہجوم — آتی ہے حسرت کی گھٹا جھوم جھوم
لگتی ہے ہمت کی کمر ٹوٹنے — حوصلے کا لگتا ہے جی چھوٹنے
ہوتی ہے بے صبری و طاقت میں جنگ — عرصۂ عالم نظر آتا ہے تنگ
جی میں یہ آتا ہے کہ سم کھائیے — پھاڑ کے یا کپڑے نکل جائیے
بیٹھنے لگتا ہے دل آوے کی طرح — یاس ڈراتی ہے چھلاوے کی طرح
ہوتا ہے شکوہ کبھی تقدیر کا — اُڑتا ہے خاکہ کبھی تدبیر کا
ٹھنتی ہے گردوں سے لڑائی کبھی — ہوتی ہے قسمت کی ہنسائی کبھی
جاتا ہے قابو سے دل آخر نکل — کرتی ہے ان مشکلوں کو تو ہی حل
کان میں پہنچی تری آہٹ جونہی — رخت سفر یاس نے باندھا وہیں
ساتھ گئی یاس کے پژمردگی — ہو گئی کافور سب افسردگی

تجھ میں چھپا راحت جاں کا ہے بھید
چھوڑ تو حالی کا نہ ساتھ اے امید

زندگی کی ایک بڑی ہی عام حقیقت کو حالی نے کس خوبی سے نظم کے سانچے میں ڈھالا ہے۔ انسان کی ذہنی کیفیت کی صحیح تصویر ان اشعار میں ملتی ہے۔ نا امیدی کے عالم میں کمر بھی ٹوٹنے لگتی ہے، حوصلوں کا جی بھی چھوٹنے لگتا ہے، کپڑے پھاڑ کر کسی طرف کو نکل جانے کا خیال بھی دل میں آتا ہے— غرض یہ کہ ان تمام منزلوں سے مایوس اور نا اُمید انسان کو گزرنا پڑتا ہے— لیکن امید ہی اس کو اس افسردگی سے نجات دلاتی ہے، اور وہ زندہ رہتا ہے۔

اس نظم کا موضوع ایسا کچھ نیا نہیں ہے — لیکن ان بدلتے ہوئے حالات میں حالی نے اس کو اپنا موضوع بنایا ہے، وہ اپنی جگہ پر بہت اہم ہے۔ یہ نظم اس زمانے کی یادگار ہے جب ہندستان کی عام زندگی پر عموماً اور مسلمانوں کی زندگی پر خصوصاً ناامیدی اور یاس کے بادل چھائے ہوئے تھے۔ اس لیے افراد کو از سر نو زندگی سے ہمکنار کرنے کے لیے اس قسم کے خیالات کا اظہار بہت ضروری تھا۔ حالی اگرچہ اس وقت ایک قومی تحریک سے وابستہ نہیں ہوئے تھے۔ لیکن ان کے حساس دل نے اس حقیقت کی اہمیت کو سمجھ ضرور لیا تھا اور وہ اس کی اہمیت کو دوسروں کے ذہن نشین بھی کرانا چاہتے تھے۔ آگے چل کر حالی کو جس منزل پر پہنچنا تھا، اس نظم میں وہ اسی منزل کی طرف قدم بڑھاتے ہوئے نظر آتے ہیں۔

حالی نے اسی زمانے میں اپنی مشہور نظم "حب وطن" لکھی۔ اس نظم کا موضوع وطن کی محبت ہے اور اگرچہ حالی کی اس ذہنی کیفیت نے اس نظم کی تخلیق کی ہے جو لاہور کے دوران قیام میں اپنے آبائی وطن سے دور ہونے کے باعث ان پر چھائی ہوئی تھی، اس لیے اس میں جذبۂ حب وطن کی نوعیت انفرادی ہے۔ لیکن اس کے باوجود کہیں کہیں اس میں حب وطن کا اجتماعی تصور بھی اپنی جھلک دکھاتا ہے۔ حالی ایک نفسیاتی نکتے سے نظم کو شروع کرتے ہیں۔ وہ نکتہ یہ ہے کہ مناظر فطرت اگرچہ بظاہر حسین ہوتے ہیں لیکن ایک غریب الوطن کے لیے ان میں وہ دلکشی باقی نہیں رہتی جو وطن میں محسوس ہوتی ہے۔ حالی آسمان کے ستاروں، زمین کے گلزاروں، پہاڑوں کی دلفریب فضاؤں، لب جو کی ٹھنڈی ہواؤں، بلبل کے نغموں، چاندنی رات کے تاروں اور نسیم بہار کے جھونکوں کو مخاطب کرکے یہ پوچھتے ہیں کہ ان میں دلکشی کیوں باقی نہیں رہی۔ وہ خود بدل گئے ہیں یا ان مناظر میں کوئی تبدیلی واقع ہوگئی ہے — اور پھر وطن سے دوری کی کیفیت کو انہوں نے بہت تفصیل سے بیان کیا ہے۔ اس میں ایک جذباتی رنگ ہے۔ اور یہ رنگ احساس کی شدت نے پیدا کیا ہے :—

اے سپہر بریں کے سیارو　　اے فضائے زمیں کے گلزارو
اے پہاڑوں کی دلفریب فضا　　اے لب جو کی ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا
اے عنادل کی نغمہ سحری　　اے شب ماہتاب تاروں بھری
اے نسیم بہار کے جھونکو　　دھر ناپائدار کے دھوکو

تم ہر اک حال میں ہو یوں تو عزیز — تھے وطن میں مگر کچھ اور ہی چیز
جب وطن میں ہمارا تھا رمنا — تم سے دل باغ باغ تھا اپنا
تم مری دل لگی کے ساماں تھے — تم مرے درد دل کے درماں تھے
تم سے کٹتا تھا رنج تنہائی — تم سے پاتا تھا دل شکیبائی
آن اک اک تمہاری بھاتی تھی — جو ادا تھی وہ جی لبھاتی تھی

اے وطن اے مرے بہشت بریں — کیا ہوئے تیرے آسمان و زمیں
رات اور دن کا وہ سماں نہ رہا — وہ زمین اور وہ آسماں نہ رہا
تیری دوری ہے مورث آلام — تیرے چھٹنے سے چھٹ گیا آرام
کاٹے کھاتا ہے باغ بن تیرے — گل ہیں نظروں میں داغ بن تیرے
مٹ گیا نقش کامرانی کا — تجھ سے تھا لطف زندگانی کا
جو کہ رہتے ہیں تجھ سے دور سدا — ان کو کیا ہوگا زندگی کا مزا
ہو گیا یاں تو دو ہی دن میں یہ حال — تجھ بن ایک ایک پل ہے ایک ایک سال

ان اشعار کی خوبی شدت احساس سے پیدا ہونے والے جذباتی رنگ میں ہے۔ حالی کا خلوص یہاں بھی کام کرتا ہوا نظر آتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے انداز اصلیت اور واقعیت کی خصوصیات سب سے زیادہ نمایاں ہیں۔ حالی کا کمال یہ ہے کہ اگرچہ انہوں نے اس میں انفرادی نقطہ نظر سے چند جذبات و احساسات کا اظہار کیا ہے لیکن ان کو اپنی ذات ہی تک محدود نہیں کردیا ہے۔ بلکہ ان اشعار میں ان کی نوعیت انسانی ہوجاتی ہے۔ حالی کے علاوہ ہر انسان پر یہ کیفیت طاری ہوسکتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان میں آفاقی رنگ پیدا ہوجاتا ہے۔

”حب وطن“ میں حالی نے اس جذبہ کی اہمیت کو پیش کرتے ہوئے بعض تاریخی واقعات کو بھی نظم کیا ہے۔ اور تاریخی تبدیلیوں کے پس منظر میں یہ بات واضح کی ہے کہ تاریخ کی انقلابی تبدیلیاں بھی اس جذبے کو لوگوں کے دلوں سے نہ نکال سکیں۔ آریا جب اس ملک میں آئے تو یہاں کے رہنے والوں نے اپنے آپ کو شدر اور راکشش کہلانا گوارا کیا لیکن وطن کو ترک نہیں کیا۔ رام چندرجی جب بن باس گئے تو ایک لمحے کو بھی اجودھیا کی یاد ان کے دل سے اوجھل نہیں ہوئی۔ آنحضرت (ص) اگرچہ بطحا سے یثرب کی

طرف چلے گئے لیکن وہاں کی یاد ان کو برابر آتی رہی ۔ پھر اسی طرح حضرت یوسف کا قصہ بیان کیا ہے ۔ اور اسی طرح مختلف مثالوں سے حب وطن کی اہمیت ذہن نشین کرائی ہے ۔ لیکن پھر یہاں سے گریز کیا ہے اور یہ بات ظاہر کی ہے کہ حب وطن کی نوعیت صرف انفرادی نہیں بلکہ اجتماعی بھی ہے ۔ یہاں پہنچ کر حالی نے اس جذبہ کو قومی زاویۂ نظر سے دیکھا ہے اور بغض و نفرت جو وطن میں موجود ہے اس کو ختم کر کے محبت کا پیام دیا ہے ۔ ان کے نزدیک بغیر اس کے حب وطن کوئی معنی نہیں رکھتا ۔ اس نظم میں یہ احساس ان پر اس طرح چھاجاتا ہے کہ وہ براہ راست افراد کو مخاطب کرکے کہنے لگتے ہیں :—

بیٹھے بے فکر کیا ہو ہم وطنو ! اٹھو اہل وطن کے دوست بنو !
مرد ہو تو کسی کے کام آؤ ورنہ کھاؤ پیو ، چلے جاؤ
جب کوئی زندگی کا لطف اٹھاؤ دل کو دکھ بھائیوں کے یاد دلاؤ
پہنو جب کوئی عمدہ تم پوشاک کرو دامن سے تا گریباں چاک
کھانا کھاؤ تو جی میں شرماؤ ٹھنڈا پانی پیو تو اشک بہاؤ
کتنے بھائی تمہارے ہیں نادار زندگی سے ہے جن کا دل بیزار

———

جاگنے والو غافلوں کو جگاؤ تیرنے والو ڈوبتوں کو تراؤ
ہیں ملے تم کو چشم و گوش اگر اور جو لی جائے کور و کر کی خبر
تم اگر ہاتھ پاؤں رکھتے ہو لنگڑے لولوں کو کچھ سہارا دو

———

ہو مسلمان اس میں یا ہندو بودھ مذہب ہو یا کہ ہو برہمو
جعفری ہووے یا کہ ہو حنفی جین مت ہووے یا ہو ویشنوی
سب کو میٹھی نگاہ سے دیکھو سمجھو آنکھوں کی پتلیاں سب کو
ملک ہیں اتفاق سے آزاد شہر ہیں اتفاق سے آباد

———

قوم پر کرتے ہو اگر احساں تو دکھاؤ کچھ اپنا جوش یہاں
کچھ دنوں عیش میں خلل ڈالو پیٹ میں جو ہے سب اُگل ڈالو
علم کو کردو کو بکو ارزاں ہند کو کر دکھاؤ انگلستان

قوم کی عزت اب ہنر سے ہے علم سے یا کہ سیم و زر سے ہے
کوئی دن میں وہ دور آئے گا بے ہنر بھیک تک نہ پائے گا
نہ رہیں گے سدا یہی دن رات یاد رکھنا ہماری آج کی بات

گر نہیں سنتے قول حالی کا
پھر نہ کہنا کہ کوئی کہتا تھا

گویا حالی اس نظم میں زندگی کے اصلاحی پہلو کی طرف توجہ کرتے ہیں۔ قوم کو عمل کے لیے اکساتے ہیں — تعمیری کاموں کی طرف راغب کرتے ہیں تاکہ وطن میں خوشحالی کا دور دورہ ہوسکے — اس طرح حالی کے یہاں حب وطن کا انفرادی تصور اپنے دائرے سے نکل کر اجتماعی اور قومی حیثیت اختیار کرلیتا ہے۔ یہاں ان پر عقل غالب آجاتی ہے۔ جذبات اس کے نیچے دب جاتے ہیں — حالی اس نظم میں اپنی منزل کی طرف جاتے ہوئے معلوم ہوتے ہیں۔

لاہور کے دوران قیام کی آخری نظم " مناظرہ رحم و انصاف " ہے۔ اس میں حالی نے رحم و انصاف کی گفتگو دکھائی ہے۔ رحم اپنی برتری ثابت کرتا ہے اور انصاف اپنی بڑائی جتاتا ہے۔ لیکن عقل ان کو صحیح راستہ دکھاتی ہے — عقل سے انہیں یہ حقیقت معلوم ہوتی ہے کہ وہ دونوں ایک دوسرے کے لیے لازم و ملزوم ہیں۔ دنیا کی بہتری کے لیے ان دونوں کا ایک ساتھ رہنا ضروری ہے۔ عقل رحم اور انصاف دونوں سے کہتی ہے کہ :-

دونوں تم خلق کے ہو مایۂ آرام و شکیب گل و شبنم کی طرح ایک سے ہے ایک کو زیب

اور بالآخر وہ دونوں ایک دوسرے سے مل جاتے ہیں :-

بڑھ کے پھر دونوں ملے ایسے کہ گویا تھے ایک مل کے ہوجائیں کہیں جیسے کہ دو دریا ایک

یہ موضوع بظاہر بڑا خشک معلوم ہوتا ہے لیکن عملی زندگی میں اس کی بڑی اہمیت ہے۔ حالی نے اس کو محسوس کیا اور اس کو ایک نئے انداز میں افراد تک پہنچانے کی کوشش کی — قومی اور اصلاحی رجحان یہاں بھی کارفرما نظر آتا ہے۔

اس دور میں حالی نے جو چار نظمیں لکھی ہیں، ان سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ حالی نظم کے میدان میں ایک نیا راستہ بنا رہے ہیں۔ موضوعات اس دور کی نظموں کے مختلف ہیں، لیکن بنیادی خیالات میں ایک اشتراک اور یک رنگی پائی جاتی ہے۔ قومی اور اصلاحی رنگ بھی نمایاں ہوے لگتا ہے۔ افادیت ہر چیز پر غالب آجاتی ہے۔ اور حالی اس طرح اردو نظم میں ایک نئی طرح ڈالتے ہیں۔ اس طرح کے موضوعات میں یوں تو نظمیں حالی سے قبل بھی لکھی گئی تھیں — مثلاً نظیر اکبرآبادی کے یہاں اسی طرح کے بعض موضوعات نظر آجاتے لیکن حالی نے جو ایک نئے زاویہ نظر سے ان موضوعات کو دیکھا ہے، اور پھر جس انداز میں ان کو پیش کیا ہے، اس میں حالی منفرد نظر آتے ہیں۔ یہ نظمیں اس بات کو صحیح ثابت کرتی ہیں کہ انہوں نے سب سے پہلے اردو نظم میں جدت کی ابتدا کی۔

(۶)

حالی لاہور میں زیادہ عرصے نہ رہ سکے۔ یہاں کی آب و ہوا انہیں راس نہیں آئی۔ اور وہ اینگلو عربک اسکول کی مدرسی پر دہلی چلے گئے۔ دہلی کے دوران قیام میں وہ پوری طرح سر سید احمد خاں اور ان کی تحریک کے زیر اثر آگئے۔ چنانچہ سر سید ہی کی تحریک پر انہوں نے ۱۸۷۹ء میں اپنی مشہور مسدس لکھی جو "مد و جزر اسلام" کے نام سے بھی مشہور ہے۔

مسدس میں حالی کا قومی شعور اپنے شباب پر نظر آتا ہے۔ اس نظم میں وہ خود روتے بھی ہیں اور دوسروں کو رلاتے بھی ہیں۔ اسلام کی بلندی و برتری کو وہ خود بھی محسوس کرتے ہیں اور دوسروں کو محسوس کراتے بھی ہیں۔ یہ نظم ایک دکھے ہوے دل کی پکار ہے۔ ایک سچے مسلمان کے دل کی گہرائیوں سے نکلی ہوی آواز ہے۔ ایک مخلص انسان کی آنکھوں سے ٹپکا ہوا آنسو ہے۔ ایک مصلح کا پیام ہے۔ ایک رہنما کا نعرہ ہے۔ اور ایک مخصوص ماحول میں پرورش پائے ہوے ایک بندۂ حق آگاہ اور مرد وفا پیشہ "زخمی کی چیخ" ہے — اس نظم میں حالی کی آواز درد میں ڈوبی ہوی نظر آتی ہے۔ ان کا خلوص اپنی بلندترین

منزلوں پر دکھائی دیتا ہے۔ ان کے احساس کی شدت اپنی اتاہ گہرائیوں میں محسوس ہوتی ہے۔ اور ان کا شعور اپنی انتہائی بلندیوں پر نظر آتا ہے۔ یہ نظم حالی کی بہترین نظم ہے۔ بلکہ یہ کہنا بےجا نہیں کہ یہ اردو کی بہترین نظموں میں سے ایک ہے۔ اور اس طرح کی نظمیں اردو میں گنتی کی دو ایک ہی لکھی گئی ہیں۔ یہ نظم حالی کو ہمارے سامنے پوری طرح پیش کرتی ہے۔ ان کی شخصیت کے سارے خدو خال اس آئینے میں پوری طرح بے نقاب نظر آتے ہیں۔

ایک مخصوص دور کے مخصوص حالات ہیں۔ ایک قوم کی مخصوص حالت نے اس نظم کی تخلیق کی ہے۔ سر سید کی تحریک نے ایک زوال آمادہ قوم کو انحطاط کے قعر مذلت سے نکالنے کے لیے جو ماحول پیدا کیا تھا اور اس ماحول کو پیدا کرنے کے لیے جن خیالات ونظریات کی نشر و اشاعت کی تھی وہ اس نظم کی تخلیق کا باعث بنے ہیں۔ یہ نظم ایک بدلتے ہوئے ماحول کی بدلتی ہوی کیفیت، اور اس ماحول میں رہنے والے افراد کے حالات کو بہتر طور پر بدلنے کی خواہش کی پیداوار ہے۔ گویا زندگی کے افادی زاویہ نظر نے اس کی تخلیق کی ہے۔ اس لیے اس وقت کے فکری رجحانات اور عملی معلومات اس میں ملتے ہیں۔ سر سید کی تحریک کی بنیاد جن خیالات پر استوار تھی، وہی اس نظم کا موضوع ہیں۔ اس لیے یہ ایک تحریک اور ایک دور کی ترجمانی ہے۔ یہ زندگی کے ایک نئے موڑ اور ماحول کے نئے تیوروں کی عکاس ہے روح عصر کی ترجمانی اس کی سب سے بڑی خوبی ہے۔ اسی خصوصیت نے اس کو زندہ جاوید کردیا ہے۔

حالی نے مسدس کے دیباچے میں اس کے موضوع کی وضاحت کرتے ہوئے لکھا ہے کہ:—

'' اس مسدس کے آغاز میں پانچ سات بند تمہید کے لکھ کر اول عرب کی اس ابتر حالت کا خاکہ کھینچا ہے جو ظہور اسلام سے پہلے تھی اور جس کا نام اسلام کی زبان میں جاہلیت رکھا گیا۔ پھر کوکب اسلام کا طلوع ہونا اور نبی امی صلعم کی تعلیم سے اس ریگستان کا سرسبز و شاداب ہوجانا اور اس ابر رحمت کا امت کی کھیتی کو رحلت کے وقت ہرا بھرا چھوڑجانا، اور مسلمانوں کا دینی اور دنیوی ترقیات میں تمام عالم پر سبقت لے جانا بیان کیا ہے۔ اس کے بعد ان

کے تنزل کا حال لکھا ہے اور قوم کے لیے اپنے بے ہنر ہاتھوں سے ایک آئینہ خانہ بنایا ہے، جس میں آکر وہ اپنے خدو خال دیکھ سکتے ہیں کہ ہم کون تھے اور کیا ہو گئے ،،۔

اس بیان سے یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ حالی نے زمانۂ جاہلیت سے لے کر اس وقت تک کی زندگی کے سارے مدو جزر کو اس نظم میں سمودیا ہے۔ لیکن اس کا موضوع تاریخ نہیں ہے۔ تاریخی واقعات کو اس میں موضوع بھی نہیں بنایا گیا ہے۔ بلکہ تاریخی واقعات کے پس منظر میں سماجی زندگی کی بعض اہم حقیقتوں کو پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ اور بنیادی چیز اس میں اصلاح کا پیام اور عمل کا جذبہ ہے، جو اس کے ہرہر بند میں نظر آتا ہے۔ اور اس کی بڑائی، بلندی اور برتری کا راز اسی اصلاح کے پیام اور عمل کے جذبے میں مضمر ہے۔

مسدس کی بڑی خوبی یہ ہے کہ وہ اس قدر طولانی ہونے کے باوجود مجموعی اعتبار سے با ربط ہے۔ اس کا کوئی حصہ بھی غیر ضروری نہیں معلوم ہوتا۔ بلکہ ایک حصہ دوسرے سے اس طرح ہم آہنگ ہے کہ ایک کو دوسرے سے الگ کرلیا جائے تو نظم کسی طرح سمجھ میں نہیں آسکتی۔ اس میں ایک ایسی وحدت ہے جو اس کے مختلف حصوں میں ایک یگانگت کا احساس دلاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مسدس کا ایک خیال دوسرے خیال کا منطقی نتیجہ معلوم ہوتا ہے۔ اور اس کی یہی خصوصیت نظم میں ایک منطقی تسلسل کو پیدا کرتی ہے۔ اور باعتبار موضوع اس کی روانی میں کوئی فرق نہیں آتا۔

حالی نے مسدس کو بقراط کے اس قول سے شروع کیا ہے کہ اس زندگی میں مرض کو مرض اور بیماری کو بیماری نہ سمجھنا ہی سب سے مہلک مرض اور سب سے بڑی بیماری ہے اور اس خیال کا اطلاق اس قوم کی زندگی پر کیا ہے جو اپنے حالات کا صحیح شعور نہیں رکھتی یہ قوم حالی کے خیال میں مسلمان قوم ہے، جس کی حالت اس وقت دگرگوں تھی۔ اس کو اپنی ذات کا احساس باقی نہیں رہا تھا۔ سر پر ادبار کی گھٹائیں چھارہی تھیں۔ مفلسی نے اس کو کہیں کا نہیں رکھا تھا۔ عزت اور ذلت کا احساس بھی باقی نہیں رہا تھا۔ غفلت عام تھی۔ غرض یہ کہ وہ تمام باتیں اس قوم میں موجود تھیں جو ایک زوال آمادہ قوم میں ہوتی ہیں۔ اس قوم نے عقل اور مذہب سے مطابق کام نہیں لیا بلکہ اپنے اعمال سے دین برحق تک کو

بدنام کیا --- وہ دین جس نے دنیا میں آکر ایک انقلاب عظیم برپا کردیا ۔ جس کے زیر اثر عرب کی سر زمین پر رہنے والے انسان جو جانوروں سے بدتر تھے صحیح معنوں میں انسان بن گئے ۔ وہاں تہذیب و تمدن کا چراغ اسی دین اسلام کے ہاتھوں روشن کیا ۔ یہ اسی دین کا اثر تھا کہ وہاں سے بت پرستی ختم ہوئی ۔ وحشت و بربریت کا خاتمہ ہوا ۔ جہالت کی تاریکیاں چھٹ گئیں ۔ صحت مند اور اخلاقی اقدار کا دور دورہ ہوا اور اس طرح یہ سر زمین ایک نئی دنیا سے آشنا ہوئی --- یہ سب کچھ آنحضرت ص کی ذات بابرکات کا اثر تھا ۔ آنحضرت ص نے عرب کے لوگوں کو یہ تعلیم دی کہ اللہ تعالیٰ کی ذات واحد کے علاوہ اور کوئی عبادت کے لائق نہیں ۔ اسی کا حکم ماننا چاہیے اور اسی پر بھروسہ کرنا چاہیے ۔ خدا کی ذات کے صحیح احساس کے ساتھ ساتھ انھیں اسلام نے معیشت کے آداب بھی سکھائے اور تمدن کے عام پہلوؤں کو ان کے سامنے واضح کیا ۔ انسانوں سے شفقت انہیں سکھائی ۔ محبت کا سبق انھیں پڑھایا ، تعصب سے ڈرایا ، محنت کرنے کی طرف توجہ دلائی ۔ صداقت اور صفائی سے ان کے سینے روشن کیے ۔ غرض یہ کہ زندگی کے زرین اصول سے انھیں آگاہ کیا اور یہ روشنی عرب سے نکل کر ایران ، ہندوستان اور دنیا کے تمام ممالک میں پھیل گئی ۔ یہ ابر جو بطحا کی چوٹیوں سے اٹھا وہ اس طرح برسا کہ اس نے ساری انسانیت کی کھیتی کو سرسبز و شاداب کردیا ۔ اور دنیا میں بہار اسی کے دم سے آئی ۔ اس نے تہذیبی ، ثقافتی ، علمی ، تعلیمی ، معاشی ، معاشرتی ، ادبی اور فنی زندگی کو نئی دنیاؤں سے روشناس کیا ۔ اس ضمن میں حالی نے اسلامی تاریخ کے مختلف ادوار کی خصوصیات کو واضح کیا ہے ۔

یہ صورت حال صرف اسلامی اصولوں کی رہین منت تھی ۔ جب تک اسلامی اصول باقی رہے زندگی ترقی کی راہوں پر گامزن رہی لیکن جب ان کو خیر باد کہہ دیا گیا تو زوال و انحطاط کے اثرات نمایاں ہونے لگے ۔ نتیجہ یہ ہوا کہ نہ ثروت قائم رہی نہ عزت ۔ اقبال و دولت نے ساتھ چھوڑ دیا ۔ علم و فن رخصت ہوگئے ۔ ساری خوبیاں مٹ گئیں ۔ اسلام کے اصولوں کا صرف نام باقی رہ گیا ۔ ان پر عمل کرنے والے نہ رہے اور یہ کیفیت سب سے زیادہ ہندستان میں نمایاں ہوئی ۔ حکومت ختم ہوگئی ۔ آدمیت باقی نہ رہی ۔ عادات و اطوار بگڑ گئے ۔ شرافت کا خاتمہ ہوگیا ۔ رسم دوستی اٹھ گئی ۔ معاشی بدحالی نے اخلاق کو پست کردیا ۔ محنت و مشقت کی عادت چھوٹ گئی اور اس کے برعکس ان کی زندگی میں اوباشی

نے گھر کرلیا - لایعنی باتوں میں وہ اپنا وقت گزارنے لگے - حالی نے اس صورت حال پر بڑے افسوس کا اظہار کیا ہے اور اس سوئی ہوئی قوم کو جھنجھوڑ کر بیدار کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس کو قعر مذلت سے باہر نکلنے کا احساس دلایا ہے - اور ایک نئی دنیا کی تصویر کھینچی ہے جو اس قوم کے لئے چشم براہ ہے۔

مسدس مسلمان کی قومی زندگی کے انحطاط و زوال کا ایک مرثیہ ہے - اس میں سوگوارانہ کیفیت ضرور ہے - ناامیدی اور مایوسی کا احساس بھی شدید نظر آتا ہے - لیکن اس کے باوجود اس کی نوعیت تخریبی نہیں ہے - اس میں تعمیری پہلو کا احساس جگہ جگہ ہوتا ہے - حالی نے جو پس منظر پیش کیا ہے، وہ بہت تاریک ہے لیکن اس تاریکی میں روشنی کی مسکراہٹیں بھی نظر آتی ہیں - محسوس ہوتا ہے کہ انکے سامنے ایک شاندار مستقبل کی تصویر ہے - اور یہ مستقبل اس قوم کا راستہ دیکھ رہا ہے - اس صورت حال نے مسدس کو شروع سے آخر تک ایک اصلاحی نظم بنا دیا ہے -

حالی فطرتاً اداس اور غمگین رہنے کے عادی نہیں - لیکن یہ اداسی اور غمگینی ان سے عمل کی خواہش اور تعمیر کے جذبے کو نہیں چھین لیتی ہے - حالی کی بڑائی اسی میں ہے کہ یہ جذبہ حالی کے یہاں ہر جگہ ملتا ہے - مسدس میں بھی یہ خصوصیت نمایاں ہے - اور اسی میں اس کی بڑائی ہے - حالی کی اس نظم میں اس طرح کے بندوں کے ساتھ ساتھ -

ادا کرچکی جب حق اپنا حکومت — رہی اب نہ اسلام کی اس کو حاجت
مگر حیف اے فخر آدم کی امت — ہوئی آدمیت بھی ساتھ اس کے رخصت

حکومت تھی گویا کہ اک جھول تم پر
کہ اترتے ہی اس کے نکل آئے جوہر

زمانے میں ہیں ایسی قومیں بہت سی — نہیں جن میں تخصیص فرماں دہی کی
پر آفت کہیں ایسی آئی نہ ہوگی — کہ گھر گھر یہ یاں چھا گئی آکے پستی

چکور اور شہباز سب اوج پر ہیں
مگر ایک ہم ہیں کہ بے بال و پر ہیں

وہ ملت کہ گردوں پہ جس کا قدم تھا ہر اک کھونٹ میں جس کا برپا علم تھا
وہ فرقہ جو آفاق میں محترم تھا وہ اُمت لقب جس کا خیرالامم تھا
نشاں اس کا باقی ہے صرف اس قدر یاں
کہ گنتے ہیں اپنے کو ہم بھی مسلماں

وگر نہ ہماری رگوں میں لہو میں ہمارے ارادوں میں اور جستجو میں
دلوں میں زبانوں میں اور گفتگو میں طبیعت میں فطرت میں عادت میں خو میں
نہیں کوئی ذرہ نجابت کا باقی
اگر ہو کسی میں تو ہے اتفاقی

ہماری ہر ایک بات میں سفلہ پن ہے کمینوں سے بدتر ہمارا چلن ہے
لگا نام آبا کو ہم سے گہن ہے ہمارا قدم ننگ اہل وطن ہے
بزرگوں کی توقیر کھوئی ہے ہم نے
عرب کی شرافت ڈبوئی ہے ہم نے

نہ قوموں میں عزت نہ جلسوں میں وقعت نہ اپنوں سے الفت نہ غیروں سے ملت
مزاجوں میں سستی دماغوں میں نخوت خیالوں میں پستی کمالوں سے نفرت
عداوت نہاں دوستی آشکارا
غرض کی تواضع غرض کی مدارا

اس نوعیت کے بند بھی ملتے ہیں —

مجھے ڈر ہے اے میرے ہم قوم یارو! مبادا کہ وہ ننگ عالم تمہیں ہو
گر اسلام کی کچھ حمیت ہے تم کو تو جلدی سے اٹھو اور اپنی خبر لو
وگر نہ یہ قول آئے گا راست تم پر
کہ ہونے سے ان کا نہ ہونا ہے بہتر

رہوگے یونہی فارغ البال کب تک نہ بدلو گے یہ چال اور ڈھال کب تک
رہے گی نئی پود پامال کب تک نہ چھوڑو گے تم بھیڑیا چال کب تک
بس اگلے فسانے فراموش کردو
تعصب کے شعلے کو خاموش کردو

حکومت نے آزادیاں تم کو دی ہیں ترقی کی راہیں سراسر کھلی ہیں
صدائیں یہ ہر سمت سے آرہی ہیں کہ راجا سے پرجا تلک سب سکھی ہیں
تسلط ہے ملکوں میں امن و اماں کا
نہیں بند رستہ کسی کارواں کا

نہیں قوم میں گرچہ کچھ جان باقی نہ ہے اس میں اسلام کی شان باقی
نہ وہ جاہ و حشمت کے سامان باقی پر اس حال میں بھی ہے اک آن باقی
بگڑنے کا گر ان کے وقت آگیا ہے
مگر اس بگڑنے میں بھی اک ادا ہے

بہت ہیں ابھی جن میں غیرت ہے باقی دلیری نہیں پر حمیت ہے باقی
فقیری میں بھی بوئے ثروت ہے باقی تہی دست ہیں پر مروت ہے باقی
مٹے پر بھی پندار ہستی وہی ہے
مکاں گرم ہے آگ گو بجھ گئی ہے

یہ سچ ہے کہ ہے قوم میں قحط انساں نہیں قوم کے پر سب افراد یکساں
سفال و خزف کے ہیں انبار گو یاں جواہر کے ٹکڑے بھی ہیں ان میں پنہاں
چھپے سنگریزوں میں گوہر بھی ہیں کچھ
ملے ریت میں ریزۂ زر بھی ہیں کچھ

اور ان سے اس بات کا اندازہ ہوتا ہے کہ حالی صرف زندگی کا تاریک پہلو ہی نہیں دیکھتے تھے رونا رلانا ہی ان کا مقصد نہیں تھا ، بلکہ زندگی کے تغیر کا بھرپور شعور ان کے پاس موجود تھا۔ اور بدلتے ہوئے حالات کے سانچے میں وہ قوم کو ڈھالنا چاہتے تھے ۔ اس کی رفتار سے ان کو ہم آہنگ کرنا بھی چاہتے تھے تاکہ ارتقا کے راستے میں وہ پیچھے نہ رہ جائے ۔ اور اس ارتقا کا تصور بھی ان کے یہاں جذباتی یا تخیلی نہیں تھا ۔ اس کی نوعیت عملی تھی۔ چنانچہ محنت کی اہمیت کا وہ بار بار احساس دلاتے ہیں۔ سفر اور تجارت کی طرف راغب کرتے ہیں۔ صنعت و حرفت کی اہمیت ذہن نشین کراتے ہیں۔ علم و

حکمت اور کسب دولت کو ضروری قرار دیتے ہیں — معاشرتی زندگی کی مذموات کو ختم کرنے کا علم ان کے ہاتھوں بلند ہوتا ہے — البتہ یہ تمام باتیں ان کے خیال میں انگریزوں کے زیرسایہ ہونی چاہئیں ۔ کیونکہ ان کی خیال میں اس زمانے میں انگریزوں نے ہندوستان کو امن کی دولت بخشی تھی اور ترقی کا سرمایہ فراہم کرنے کے لیے راہیں دکھائی تھیں — حالی اس وقت کے حالات کو دیکھ کر ان خیالات کو پیش کرنے کے لیے مجبور تھے ۔ کیونکہ وہ سر سید کی تحریک کی ترجمانی کر رہے تھے اور اس تحریک نے ان خیالات کو اس وقت حقیقتوں کا روپ دے دیا تھا — اس طرح مسدس میں حالی کی آواز اپنے وقت کی آواز بن جاتی ہے۔ سر سید تک کو اس کا احساس تھا ۔ جب ہی تو انھوں نے لکھا کہ " قیامت میں جب خدا تعالیٰ مجھ سے پوچھے گا کہ ہمارے واسطے کیا لایا تو میں کہوں گا " مسدس حالی "— اس سے بڑا خراج تحسین مسدس کے لیے اور کیا ہوسکتا ہے۔ اس لیے یہ کہنا بے جا نہیں کہ سر سید کی تحریک نے مسدس کو زندہ جاوید کردیا اور مسدس نے سر سید کی تحریک کو بقائے دوام بخشا ۔

مسدس حالی کی بڑائی کا راز اس کے بے پناہ خلوص میں ہے، سوز و گداز میں ہے، حقیقت و واقعیت میں ہے اصلیت اور جوش میں ہے، تفصیل و جزئیات میں ہے، تسلسل اور روانی میں ہے۔ حالی نے ان تمام خصوصیات کو اس نظم میں اس خوبی سے یکجا کیا ہے کہ اس کی مثال خود ان کی منظومات میں بھی کہیں اور مشکل سے ملتی ہے۔ لوگ کہتے ہیں مسدس میں جمالیاتی خوبیاں کم ہیں یا بالکل نہیں ہیں ۔ لیکن حالی نے اس نظم میں جس چابک دستی کے ساتھ اپنے موضوع کو ہیئت سے ہم آہنگ کیا ہے، جس طریقے سے مواد اور صورت میں مناسبت پیدا کی ہے۔ اس کی روشنی میں یہ بات دل کو نہیں لگتی ۔ کیونکہ اس میں تاثر کی وہ سحرکاری ہے جو اسی ہم آہنگی کا نتیجہ ہے۔ اور جو بغیر ایک شدید جمالیاتی احساس کے وجود میں نہیں آسکتی تھی ۔ مسدس اس اعتبار سے بھی اردو نظموں میں منفرد حیثیت رکھتی ہے ۔ اور یہی وجہ ہے کہ اس کا اثر لازوال ہے۔

(۷)

حالی کی نظم‌نگاری کو اب ایک نیا رستہ مل جاتا ہے — 'مسدس' جس گہرے شعور کے نتیجے میں لکھی گئی ہے، اسے اب حالی کی نظموں میں نمایاں حیثیت حاصل ہوجاتی ہے

چنانچہ قومی زندگی کے متنوع پہلوؤں پر وہ قلم اٹھاتے ہیں - علمی، تعلیمی، معاشی، معاشرتی کوئی پہلو بھی ان کی نظروں سے اوجھل نہیں ہوتا۔ وہ ان تمام موضوعات پر اپنے مخصوص انداز میں نظمیں لکھتے ہیں — گہری سنجیدگی حالی پر غالب آجاتی ہے — سوز و گداز میں وہ ڈوب جاتے ہیں۔ نظر میں وسعت پیدا ہوجاتی ہے احساسات گہرائی میں ڈھل جاتے ہیں — یہی وجہ ہے کہ حالی کے موضوعات میں عمق گہرائی پیدا ہوجاتی ہے۔ ان کا شعور نئے مسائل کریدتا ہے اور ان کی نظمیں ان مسائل کی ترجمانی کرتی ہیں۔

مسدس کے بعد حالی نے مختلف قومی مسائل پر جو نظمیں لکھی ہیں ان میں عورتوں کے مسائل سے متعلق نظموں کو خاص اہمیت حاصل ہے۔ اس سے قبل ان موضوعات کی طرف کسی اور نے توجہ نہیں کی تھی - اردو شاعری میں عورت کو صرف محبوب کا مرتبہ حاصل تھا وہ محض تعیش کا ایک ذریعہ تھی — اس کی معاشرتی حیثیت کو کسی نے پیش نظر نہیں رکھا تھا - اور اس کی سب سے بڑی وجہ یہی تھی کہ معاشرت میں اسے کوئی حیثیت حاصل نہیں تھی۔ افراد اسے صرف ایک کھلونا سمجھتے تھے - سرسید نے اس صورت حال کو محسوس کیا اور عورت کی سماجی حیثیت کو متعین کرنے کی کوشش کی اور اس طرح سماجی زندگی میں عورت کے مسائل کو سلجھانے کی ایک فضا پیدا ہوئی - چنانچہ اردو شاعری نے بھی ان مسائل کو اپنا موضوع بنایا - حالی اس میں پیش پیش رہے۔ انہوں نے عورتوں کے مسائل سے متعلق دو بڑے معرکے کی نظمیں لکھیں - ایک تو 'مناجات بیوہ' اور دوسری 'چپ کی داد'! 'مناجات بیوہ' ۱۸۹۷ء میں لکھی گئی اور 'چپ کی داد' ۱۹۰۵ء میں مکمل ہوکر سامنے آئی۔

'مناجات بیوہ' میں حالی نے ایک بڑے اہم سماجی مسئلے کو اپنا موضوع بنایا ہے۔ یہ مسئلہ بیوہ کا مسئلہ ہے۔ ہندوستان اور مسلمانوں کی زندگی میں اس کے اہم ہونے کی وجہ یہ ہے کہ یہاں عورت کی زندگی اس کے شوہر سے عبارت ہے۔ وہ شوہر کے لیے پیدا ہوتی ہے اور اسی کے لیے زندہ رہتی ہے - اس لیے اگر شوہر مرجائے تو اس کی زندگی اس دنیا کے لیے بوجھ بن جاتی ہے - اس سے اچھا برتاؤ نہیں کیا جاتا - توہم پرستی اس کی ذات کو منحوس قرار دیتی ہے۔ بدگمانی اس کو شک کی نظروں سے دیکھتی ہے - لوگ اس کے سائے سے بھی بچتے ہیں - حالی نے ہندوستانی سماج کے اس مسئلے کی اہمیت کو محسوس کیا اور حد درجہ خلوص کے ساتھ انتہائی سوز و گداز میں ڈوبی ہوئی یہ نظم لکھی -

اس نظم میں ایک بیوہ خدا کے حضور میں فریاد کرتی ہے۔ پہلے خدا کی ذات اور اس کے مرتبے کی تعریفیں ہیں۔ بیوہ خدا کو مخاطب کرکے کہتی ہے کہ خدا کی ذات ہی اس دنیا میں سب کچھ کرنے والی ہے۔ اسی سے رحمت ہے۔ وہی غریبوں اور مسکینوں کا سہارا ہے۔ اسی کے دم سے کھیتیاں ہری بھری ہیں۔ وہی خوشی بخشتا ہے اور وہی غم دیتا ہے اور یہ خوشی و غم کا سلسلہ دنیا میں چلتا رہتا ہے۔ امید کی شمع ہر فرد کے دل میں خدا کی ذات ہی روشن کرتی ہے۔ لیکن صرف ایک ہی ایسی مخلوق ہے جس کے یہاں غم ہی غم ہے۔ جس کا غم خوشی سے نہیں بدل سکتا۔ جس کا اجڑا ہوا گھر کبھی بس نہیں سکتا۔ جس کے چمن میں کبھی بہار نہیں آئے گی — جو زندگی بھر اسی طرح زندہ درگور رہے گی۔ اور یہ ہندوستانی بیوہ ہے۔ یہ بیوہ اس صورت حال سے اکتاکر خود اپنی جان کی دشمن ہوجاتی ہے۔ اور اپنے آپ کو زندگی کے لیے بوجھ سمجھنے لگتی ہے۔ اور اس صورت حال سے متاثر ہوکر بارگاہ خداوندی میں اپنی ذہنی کیفیت، اپنی الجھنیں، اپنی پریشانیاں، اپنی زندگی کے بنیادی مسائل، اپنی بےبسی اور کس مپرسی۔ ان سب کو تفصیل سے بیان کرتی ہے اور خدا سے مدد چاہتی ہے۔ تاکہ اس کے بازوؤں میں زندگی سے مطابقت پیدا کرنے کی سکت پیدا ہو — یہی مناجات بیوہ کا موضوع ہے۔

حالی نے اس موضوع کو بڑے جذباتی انداز میں پیش کیا ہے۔ لیکن اس جذباتی فضا کو پیدا کرنے میں وہ بالکل جذباتی نہیں ہوگئے ہیں۔ بلکہ انہوں نے عقل و شعور سے بھی کام لیا ہے۔ اور بیوہ کے مسائل کی حقیقت و واقعیت سے بھرپور تصویر کھینچی ہے — بیوہ اس میں ایک خالص ہندوستانی کردار ہے۔ یہ کردار ماحول اور گرد و پیش کے حالات کا اسیر ہے۔ اس لیے وہ ان سے ایک مطابقت پیدا کرتا ہے۔ بیوہ اپنے متعلق جو کچھ بھی کہتی ہے وہ خدا سے کہتی ہے۔ کیونکہ اس کا عقیدہ ہے کہ خدا کی ذات ہی سب کچھ ہے۔ وہی سب کچھ کرنے والا ہے۔ چنانچہ وہ اس کو براہ راست مخاطب کرتی ہے اور اس مخاطبت میں اپنی زندگی کے سارے مدو جزر کو پیش کردیتی ہے۔ اس تخاطب میں حد درجہ عجز اور نیاز مندی ہے۔ حالانکہ پس منظر میں ایک تلخی ہے اور اسی تلخی نے اس کو یہ سب کچھ کہنے کے لیے مجبور کیا ہے — حالی نے بیوہ کے کردار کو مثالی طور پر ہندوستانی بنانے کی کوشش کی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس میں باوجود ایک تلخی کے جھنجلاہٹ نہیں ہے — جھنجلاہٹ کیا، اس میں

شکایت تک کا پہلو کم ہے — بے بسی کے اظہار میں کہیں کہیں ایک دبی ہوئی سی چیخ ضرور سنائی دی جاتی ہے — لیکن یہ آواز بھی بہت واضح نہیں ہوتی — یہ صورت حال ہندستانی روایات کو پیش نظر رکھنے کا نتیجہ ہے — ان خیالات کا اظہار ایک ہندوستانی عورت ہی کرسکتی ہے :—

بیکس کا غم خوار ہے تو ہی — بری بنی کا یار ہے تو ہی
دکھیا دکھی، یتیم اور بیوہ — تیرے ہی ہاتھ ان سب کا ہے کھیوا
تو ہی ڈبوئے تو ہی ترائے — تو ہی یہ بیڑے پار لنگھائے
تو ہی مرض دے تو ہی دوا دے — تو ہی دوا دارو میں شفا دے
تو ہی پلائے زہر کے پیالے — تو ہی پھر امرت زہر میں ڈالے
تو ہی دلوں میں آگ لگائے — تو ہی دلوں کی آگ بجھائے
چمکارے چمکار کے مارے — مارے مار کے پھر چمکارے
پیار کا تیرے پوچھنا کیا ہے — مار میں بھی اک تیری مزا ہے

لیکن ان اشعار میں اصل موضوع کی طرف کتنے بلیغ اشارے ہیں۔ ان اشاروں سے کردار بھی ابھرتا ہے، اور ماحول کے خدو و خال بھی اجاگر ہوتے ہیں۔

حالی نے اس نظم میں جذبات کی جو تصویریں پیش کی ہیں، ان میں بھی ہندوستانی رنگ بھرا ہے — اور جذبات کی یہ تصویریں اس نظم میں بے شمار ہیں۔ بلکہ یہ کہنا بے جا نہیں کہ ساری نظم انہی جذبات کی ترجمانی پر مشتمل ہے۔ چنانچہ ساری نظم میں ایک مانوس ہندوستانی ماحول ملتا ہے :—

وہ گرمی کی چاندنی راتیں — وہ ارمان بھری برساتیں
کس سے کہوں کس طور سے کاٹیں — خیر، کٹیں جس طور سے کاٹیں
چاؤ کے اور خوشیوں کے سمے سب — آتے ہیں خوش کل جان کو ہو جب
رنج میں ہیں سامان خوشی کے — اور جلانے والے جی کے
یہ برکھا اور پیا بدیسی — آئیو برکھا کہیں نہ ایسی
دن یہ جوانی کے ہیں ایسے — باغ میں پنچھی قید ہو جیسے
رت گئی ساری سر ٹکراتے — اڑ نہ سکے پر ہوتے ساتے

یہ خصوصیت بذات خود بھی اہم ہے، لیکن اس سے زیادہ اہم یہ بات ہے کہ حالی کی اس خصوصیت نے جذبات نگاری کو اپنے کمال پر پہنچادیا ہے -- ان میں حقیقت و واقعیت ہرجگہ نمایاں ہوجاتی ہے اور اس طرح تاثر کی کیفیت میں اضافہ ہوتا ہے -- ذیل کے اشعار سے یہ بات واضح ہوتی ہے :-

آئیں بہت دنیا میں بہاریں — عیش کی گھر گھر پڑیں پکاریں
پڑے بہت باغوں میں جھولے — ڈھک بہت [redacted] میں پھولے
گئیں اور آئیں چاندنی راتیں — برسیں کھلیں بہت برساتیں
پر نہ کھلی ہرگز نہ کھلے گی — وہ جو کلی مرجھائی تھی دل کی
آس ہی کا یاں نام ہے دنیا — جب نہ رہی یہ ہی تو رہا کیا
ایسے بدیسی کا نہیں غم کچھ — جس کو نہ ہو ملنے کی قسم کچھ
رونا ان بن باسیوں کا ہے — دیس نکالا جن کو ملا ہے

روک کے اور یوں تھام کے آپا — میں نے یہ کاٹا اپنا رنڈاپا
ایک نہ سنبھلا میرا سنبھالا — تھا بیتاب جو اندر والا
حال کروں میں دل کا بیاں کیا — حال ہے دل کا تجھ سے نہاں کیا
دھوپ تھی تیز اور ریت تھی تپتی — مچھلی تھی اک اس میں تڑپتی
جان نہ مچھلی کی تھی نکلتی — اور نہ سر سے دھوپ تھی ٹلتی
گو دم بھر اس دل کی لگی نے — ٹھنڈا پانی دیا نہ پینے
تو ہے مگر اس بات کا دانا — میں نے کہا دل کا نہیں مانا

مناجات بیوہ میں اس قسم کی تصویریں بے شمار ہیں اور ان تصویروں سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ حالی کو جذبات نگاری میں کیا کمال حاصل ہے۔

مناجات بیوہ میں یہ جذبات نگاری اگرچہ بنیادی حیثیت رکھتی ہے لیکن اس کے علاوہ تفصیل اور جزئیات نگاری بھی خاصے کی چیز ہے۔ یہ تفصیل و جزئیات کے عناصر بیوہ کی حالت

کے بیان میں بھی ملتے ہیں یہ غلط رسم و رواج کے بیان میں بھی نظر آتے ہیں۔ عورت کی بے بسی اور کمزوری کے ذکر میں بھی نمایاں ہوتے ہیں۔ غرض یہ کہ ساری نظم میں یہ خصوصیت موجود ہے، لیکن اشاروں اور کنایوں کو ان کے ساتھ حالی نے کچھ اس طرح سمویا ہے کہ اسے چار چاند لگ گئے ہیں۔

حالی نے جن خیالات پر مناجات بیوہ کی بنیاد رکھی ہے وہ گہرے سماجی شعور کا نتیجہ ہیں۔ حالی کو ہندوستانی سماج کی پیچیدگیوں کا پوری طرح اندازہ ہے۔ اس سماج میں وہ عورت کی حیثیت کو بھی صحیح طور پر محسوس کرتے ہیں۔ غلط رسوم و رواج کا بھی انہیں احساس ہے۔ سماجی بندشیں بھی ان کے پیش نظر ہیں۔ وہ ان سب میں اصلاحی تبدیلیاں چاہتے ہیں تاکہ انسانی فطرت کو ان شکنجوں سے باہر نکل سکے۔ اور اسے اس زندگی میں پھلنے پھولنے اور پروان چڑھنے کا موقع ملے۔ مناجات بیوہ میں یہ سب باتیں بہت واضح نہیں ہیں لیکن اس میں چھپی ہوئی ضرور نظر آتی ہیں اور اسی خصوصیت میں اس کی بڑائی کا راز مضمر ہے۔

'چپ کی داد' بھی کچھ اسی طرح کی نظم ہے۔ یہ نظم ۱۹۰۵ء میں لکھی گئی اس میں وہ سوز و گداز نہیں جو 'مناجات بیوہ' کی امتیازی خصوصیت ہے۔ لیکن اس میں اصلاح کا خیال زیادہ غالب ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس میں زندگی کے غلط نظام کا جہاں ذکر ہوتا ہے وہاں خاصی تلخی پیدا ہوجاتی ہے۔ حالی نے عورت کی اہمیت کو محسوس کیا ہے اور معاشرت میں اس کے صحیح رتبے کو متعین کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس سلسلے میں حالی نے عورت کی زندگی کے مد و جزر کو بڑی وضاحت سے پیش کیا ہے۔ اور اس مد و جزر کے بیان سے ان کے موضوع کی تصویر زیادہ ابھرتی ہے۔ اس تصویر کے لیے اس مد و جزر کا بیان ایک پس منظر کا کام کرتا ہے۔

حالی نے اس نظم میں عورت کو ماں، بہن اور بیٹی کہہ کر پکارا ہے۔ ورنہ اس سے قبل تو اردو شاعری میں عورت صرف محبوب تھی، صرف تعیش کا ذریعہ تھی، اور اکثر جگہ تو وہ طوائف ہی نظر آتی ہے۔ حالی نے سب سے پہلے عورت کو معاشرت میں ایک مرتبہ دیا۔ مختلف زاویوں سے اس کی اہمیت ذہن نشین کرائی۔ انہوں نے عورت کو قوم کی عزت قرار دیا۔ اس حقیقت کی طرف توجہ دلائی کہ عورت ماں، بہن اور بیٹی ہے اور زندگی اس کے بغیر ناممکن

ہے۔ گھروں میں رونق انہیں کے دم سے ہوتی ہے۔ کیونکہ ان میں خلوص ہوتا ہے۔ محبت ہوتی ہے۔ صداقت ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہر حال میں عورت کا وجود زندگی کے لیے لازمی ہے۔ زندگی ایک کشمکش کا نام ہے اور اس کشمکش میں عورت ایک سہارا ہے، ایک تسلی ہے۔ وہ کشمکش کی ان منزلوں کو آسان کردیتی ہے۔ حالی نے اس بنیادی نکتے کو بیان کرنے کے بعد ہندستانی عورت کی زندگی کے انداز کو پیش کیا ہے۔ ان کے خیال میں ہندوستانی عورت کا وجود خدمت سے عبارت ہے۔ ہندستانی عورت بچپن میں ماں باپ اور بہن بھائیوں کی خدمت کرتی ہے۔ جوانی میں شوہر اور سسرال والوں کی خدمت کرتی ہے، غرض یہ کہ اس کی ساری زندگی اسی فکر میں گزر جاتی ہے کہ کسی کا دل میلا نہ ہو اس لیے وہ خون جگر کو بھی شربت کے گھونٹوں کی طرح پیتی رہتی ہے۔ شادی کے بعد بچوں کی پرورش ہندوستانی عورت کا سب سے بڑا فرض ہے۔ چنانچہ وہ ان کی پرورش کرتی ہے اور اپنی زندگی کو تج دیتی ہے۔ کھانا پینا، پہننا اوڑھنا تک بھول جاتی ہے۔ یہ کام عورت کا سب سے اہم کام ہے۔ اس پرورش میں بچوں کی تربیت بھی شامل ہے۔ اور تربیت ہی انسان کو انسان بناتی ہے۔ ماں کے سائے ہی میں دنیا کے بڑے بڑے لوگ پیدا ہوتے ہیں۔ ماں کا بڑا گہرا اثر ان کی شخصیتوں پر ہوتا ہے، بلکہ وہ سب کچھ ماں کی شخصیت ہی سے حاصل کرتے ہیں۔ بڑے بڑے بادشاہ مصلح، واعظ، فلسفی، صوفی، شاعر اور ادیب سب کے سب ماں کی گودوں کے زینے ہی سے اوپر چڑھتے ہیں۔ لیکن حالی کے خیال میں انسانی تہذیب نے عورت کو ان تمام باتوں کا صلہ نہیں دیا۔ اس کی اہمیت کو سمجھا نہیں۔ اس پر ظلم و ستم ہوتے رہے۔ اسے محکوم رکھا گیا۔ مرد کی حلقہ بگوشی سے وہ باہر نہ نکل سکی۔ کہیں وہ پیدا ہوتے ہی قتل کی گئی۔ کہیں زندہ دفن کردی گئی۔ کہیں اسے مردہ خاوند کے ساتھ زندہ جلنا پڑا۔ کہیں اس کی شادی اس طرح کی گئی جیسے مجرم کو کوئی سزا دیتا ہے۔ کہیں بیوگی کے عالم میں دنیا اس کی چھاتی پر مونگ دلتی رہی۔ غرضیکہ عورت کو اس کام کا صحیح صلہ کچھ بھی نہیں ملا۔ وہ علم کی دولت سے محروم رکھی گئی۔ ہر دور میں لوگ اسے شبہ کی نظروں سے دیکھتے رہے۔ اسے گمنامی کے غاروں میں دھکیل دیا گیا اور اس طرح عورت کی زندگی موت سے بدتر ہوگئی۔ حالی اس صورت حال پر کڑھتے ہیں لیکن انہیں یقین ہے کہ انصاف

کا وقت قریب ہے اور دنیا کو اپنی ان بے انصافیوں کا جواب دینا پڑے گا، جو تہذیب و تمدن کے مختلف ادوار میں اس نے عورت کے ساتھ روا رکھی ہیں۔

اس تفصیل سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ حالی عورت کے بنیادی مسائل کا بڑا گہرا شعور رکھتے ہیں اور انسانی زندگی میں اس کی اہمیت اور بلندی کے ساتھ ساتھ انہیں اس کی بے بسی اور بے بسی کا بھی شدید احساس ہے۔ چنانچہ وہ اس صورت حال کی اصلاح بھی چاہتے ہیں۔ انہیں یقین ہے کہ زندگی کے بدلتے ہوئے حالات میں عورت کے مسئلے کو اس اصلاح سے دو چار ہونا لازمی ہے۔ حالی نے اس اصلاح کے پہلو کی وضاحت تفصیل کے ساتھ نہیں کی ہے، لیکن عورت کے متعلق جن پہلوؤں کو اجاگر کیا ہے ان سب میں اس اصلاح کا جذبہ کارفرما نظر آتا ہے۔ عورت کی اہمیت کا ذہن نشین کرانا ہی اس بات کی دلیل ہے کہ حالی اس کے متعلق روایتی صورت حال کو بدلنا چاہتے ہیں، جب وہ یہ کہتے ہیں :—

اے ماؤ! بہنو! بیٹیو! دنیا کی عزت تم سے ہے
ملکوں کی بستی ہو تمہیں قوموں کی عزت تم سے ہے
تم گھر کی ہو شہزادیاں شہروں کی ہو آبادیاں
غمگین دلوں کی شادیاں دکھ سکھ میں راحت تم سے ہے
تم ہو تو غربت ہے وطن، تم بن ہے ویرانہ چمن
ہو دیس یا پردیس جینے کی حلاوت تم سے ہے
نیکی کی تم تصویر ہو عفت کی تم تدبیر ہو
ہو دین کی تم پاسباں، ایماں سلامت تم سے ہے
فطرت تمہاری ہے حیا، طینت میں ہے مہر و وفا
گھٹی میں ہے صبر و رضا انساں عبارت تم سے ہے

یہ بات صاف واضح ہوتی ہے کہ حالی کے پیش نظر ایک مثالی ماحول کی مثالی عورت ہے، جس کے بغیر زندگی کی تکمیل ناممکن ہے جب وہ کہتے ہیں :—

میکے میں سارے گھر کی تھیں گو مالک مختار تم
پھر سارے کنبے کی رہیں بچپن سے خدمت گار تم

ماں باپ کے حکموں پہ پتلی کی طرح پھرتی رہیں
غم خوار باپوں کی رہیں ماؤں کی تابعدار تم
دن بھر کا تار بندھنا ، سینا پرونا ٹانکنا
بیٹھیں نہ گھر ھر باپ کے خالی کبھی زنہار تم
راتوں کو چھوٹے بھائی بہنوں کی خبر اٹھ اٹھ کے لی
بچہ کوئی سوتے میں رویا اور ھوئیں بیدار تم
سسرال میں پہنچیں تو واں اک دوسرا دیکھا جہاں
جا اتریں گویا دیس سے پردیس میں اک بار تم
واں فکر تھی ھر دم یہی ناخوش نہ تم سے ھو کوئی
اپنے سے رنجش کے کبھی پاؤ نہ واں آثار تم
بدلے نہ شوھر کی نظر سسرے کا دل میلا نہ ھو
آنکھوں میں ساس اور نند کی کھٹکو نہ مثل خار تم
پالا بروں سے گر پڑے بد خو ھوں سب چھوٹے بڑے
چتوں پہ میل آنے نہ دو گو دل میں ھو بیزار تم
غم کو غلط کرتی رھو سسرال میں ھنس بول کر
شربت کے گھونٹوں کی طرح پیتی رھو خون جگر

تو اس میں عورت کی بلندی کے ساتھ ساتھ اس بات کا بھی ایک چھپا ھوا احساس ملتا ھے کہ باوجود حالات سے اس مطابقت کے جو عورت کی ذات کا جزو ھے اس کے ساتھ خاطر خواہ سلوک روا نہیں رکھا جاتا ۔ یہی وجہ ھے کہ زندگی سنوری نہیں ۔ اس میں نکھار نہیں پیدا ھوا ۔ حالات ارتقا کے راستے پر گامزن نہیں ھوئے ۔

حالی کو اس بات کا شدید احساس ھے کہ انسانی زندگی کے بعض شعبے ایسے ھیں جن کی تکمیل صرف عورت ھی کر سکتی ھے ۔ مردوں کے بس کی بات نہیں ۔ مثلاً بچوں کا پالنا صرف عورت ھی کا حصہ ھے اور فطرت نے اسی کو اس کام کے لیے بنایا ھے :-

تھا پالنا اولاد کا مردوں کے بوتے سے سوا
آخر یہ اے دکھیاریو! خدمت تمہارے سر پڑی
پیدا اگر ہوتیں نہ تم بیڑا نہ ہوتا پار یہ
چیخ اٹھتے دو دن میں ، اگر مردوں پہ پڑتا بار یہ

اور اس کے ساتھ ہی ساتھ بچوں کی تربیت بھی عورت ہی کے زیر سایہ ہوتی ہے۔ چنانچہ بڑی سے بڑی شخصیتیں بھی اسی کی آغوش میں نشو و نما پاتی ہیں۔

سرکار سے مالک کی جتنے پاک بندے ہیں بڑے
وہ ماؤں کی گودوں کے زینے سے ہیں سب اوپر چڑھے

لیکن اس کے باوجود جب حالی کی نظر عورت کی ہستی کو اس زندگی میں نظر انداز ہوتے ہوئے دیکھتی ہے تو چیخ اٹھتے ہیں :—

افسوس! دنیا میں بہت تم پر ہوئے جور و جفا
حق تلفیاں تم نے سہیں بے مہریاں جھیلیں سدا
اکثر تمہارے قتل پر قوموں نے باندھی ہے کمر
دیں تاکہ تم کو یک قلم خود لوح ہستی سے مٹا
گاڑی گئیں تم مدتوں مٹی میں جیتی جاگتی
حامی تمہارا تھا نہ یاور کوئی جز ذات خدا
زندہ سدا جلتی رہیں تم مردہ خاوندوں کے ساتھ
اور چین سے عالم رہا یہ سب تماشے دیکھتا
بیاھی گئیں اس وقت تم جب بیاہ سے واقف نہ تھیں
جو عمر بھر کا عہد تھا وہ کچے دھاگے سے بندھا
بیاھا تمہیں ماں باپ نے اے بے زبانو! اس طرح
جیسے کسی تقصیر پر مجرم کو دیتے ہیں سزا

گزری امید و بیم میں جب تک رہا باقی سہاگ
بیوہ ہوئیں تو عمر بھر پھر چین قسمت میں نہ تھا
تم سخت سے سخت امتحاں دیتی رہیں پر رائگاں
کیں تم نے جانیں تک فدا ، کہلائیں لیکن بے وفا
گو صبر کا اپنے نہ اچھا تم دو ،کلا انعام یاں
پر جو فرشتے سے نہ ہو وہ کر گئیں تم کام یاں

اور یہ سب کچھ حقیقت پر مبنی ہے ۔ حالی نے عورت کی پوری تاریخ اور سارے مسائل کو ان چند اشعار میں پیش کردیا ہے ۔ گویا دریا کو کوزے میں بند کرنے کی کوشش کی ہے اور وہ اس میں کامیاب ہیں ۔ کیوں کہ حالی نے جس مقصد کو سامنے رکھ کر ان خیالات کو پیش کیا ہے ، وہ پڑھنے والے پر خاطر خواہ اثر کرتے ہیں اور وہ اس سلسلے میں حالی کا ہم آواز ہوجاتا ہے ۔

حالی کے خیال میں عورت کی سب سے بڑی حق تلفی یہ ہے کہ اسے علم کی دولت سے محروم رکھا گیا ۔ حالاں کہ عورت نے اپنے طرز عمل سے اپنے آپ کو فخر نوع بشر ثابت کرنے کی کوشش کی ۔ جن لوگوں نے عورت پر علم کے دروازوں کو بند کیا ان میں وہ نیک مرد بھی شامل تھے جو بظاہر عورت کے نام کے عاشق رہے :—

گو نیک مرد اکثر تمھارے نام کے عاشق رہے پر نیک ہوں یا بد رہے سب متفق اس رائے پر
جب تک جیو تم علم و دانش سے رہو محروم یہاں آئی ہو جیسی بے خبر ، ویسی ہی جاؤ بے خبر
تم اس طرح مجہول اور گم نام دنیا میں رہو ہو تم کو دنیاکی نہ دنیا کو تمہاری ہو خبر
جو علم مردوں کے لیے سمجھا گیا آب حیات ٹھیرا تمہارے حق میں وہ زہر ہلاہل سربسر

لیکن حالی کو اس بات کا بھی احساس ہے کہ اب یہ صورت حال زیادہ عرصے تک باقی رہنے والی نہیں ۔ کیونکہ حالات بدل رہے ہیں ۔ اور بدلتے ہوئے حالات میں یہ آواز صاف سنائی دیتی ہے ۔

آتا ہے وقت انصاف کا نزدیک ہے یوم الحساب
دنیا کو دینا ہوگا ان حق تلفیوں کا وہاں جواب

اور یہ آواز وقت کی آواز ہے۔

حالی نے ان دو نظموں میں عورت کے جن مسائل کی ترجمانی کی ہے اس میں وہ منفرد نظر آتے ہیں۔ ان کا موضوع اچھوتا اور نیا ہے۔ اردو شاعری میں حالی سے قبل اس موضوع پر کسی نے توجہ نہیں کی۔ حالی نے سب سے پہلے اس کو پیش کیا۔ یہ بڑی حد تک بدلتے ہوئے حالات کا نتیجہ ہے۔ حالی سرسید کی تحریک کے ترجمان بلکہ نقیب تھے۔ اور سرسید کی تحریک میں عورت کے مسائل کو نمایاں حیثیت حاصل تھی۔ ایک غلط نظام میں عورت پر جو ظلم روا رکھے گئے تھے، جس طرح اس کی ہستی کو نظر انداز کردیا گیا تھا، جس طرح اس کے بنیادی مسائل سے چشم پوشی کی گئی تھی، وہ سر سید کی تحریک کے نزدیک باعث ننگ تھا۔ اسی لیے وہ ان کی طرف متوجہ ہوئے۔ تعلیم نسواں کو انہوں نے خاص طور پر اپنے پیش نظر رکھا۔ کیونکہ جہالت ہی ان تمام خرابیوں کی جڑ تھی۔ حالی نے اس تحریک سے متاثر ہوکر یہ نظمیں لکھی ہیں۔ اور اس طرح اپنے دور کی ترجمانی کی ہے۔ حالی کی شخصیت میں جو سنجیدگی تھی، جو خلوص تھا، جو سوز و گداز تھا، اس نے ان نظموں میں نئی جان پیدا کردی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان میں تاثر کا جادو ہے۔ حالی نے ان نظموں میں وعظ نہیں کہا ہے۔ لیکن ان کی تہہ میں ہلکی سی تلخی کی دبی ہوئی چنگاری ضرور ہے جو پڑھنے والے کو اپنا ہم نوا بنالیتی ہے اور اس طرح حالی کا مقصد پورا ہوجاتا ہے۔

(۸)

مسدس، 'مناجات بیوہ' اور 'چپ کی داد' سے قبل اور ان کے بعد حالی نے اور بھی متعدد نظمیں لکھی ہیں۔ ان نظموں کے موضوعات مختلف ہیں۔ لیکن وہ سب ایک مخصوص زاویۂ نظر سے لکھی گئی ہیں۔ اس دور کے مذہبی، علمی، تعلیمی، معاشی، معاشرتی، سیاسی تاریخی جتنے بھی مسائل تھے ان سب کو حالی نے اپنا موضوع بنایا ہے۔ ان میں سے بعض مختلف جلسوں کے لیے لکھی گئی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان میں کہیں کہیں واعظانہ رنگ بھی پیدا ہوجاتا ہے۔ اور وہ شعری اعتبار سے سپاٹ بھی ہوجاتی ہیں۔ لیکن حالی کا خلوص ان میں زندگی کی لہریں دوڑاتا ہے۔ اور اس طرح انہیں ایک نظم کی حیثیت سے ایک زندگی ملتی ہے۔ یہ نظمیں شاعرانہ اعتبار سے 'مسدس'، 'مناجات بیوہ' اور 'چپ کی داد' کی طرح بلند

نہیں ہیں - لیکن ان سے حالی کے نقطۂ نظر کی پوری طرح وضاحت ہوتی ہے - وہ مختلف مسائل کے بارے میں جو کچھ سوچتے تھے اس کا اندازہ ہوتا ہے ، بلکہ بعض بنیادی باتیں سامنے آتی ہیں - اس لیے ایک نظم نگار کی حیثیت سے حالی کا مرتبہ متعین کرنے کے لیے ان پر غور کرنا ناگزیر ہے -

اس طرح کی متعدد نظمیں حالی نے لکھی ہیں ، ان میں علمی و تعلیمی معاملات سے متعلق مختلف ترکیب بند جو انہوں نے محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس اور انجمن حمایت اسلام کے مختلف جلسوں میں پڑھے - معاشرتی اور معاشی موضوعات پر مسدس موسوم بہ ' ننگ خدمت ، فلسفۂ ترقی ، ' تعصب و انصاف ، ' مناظرۂ رحم و انصاف ، ' مناظرۂ واعظ و شاعر ، ' دولت اور وقت کا مناظرہ ، خاص طور پر قابل ذکر ہیں -

تعلیمی معاملات حالی نے متعدد نظمیں لکھی ہیں لیکن ان میں جو خیالات پیش کیے گئے ہیں ان سب کا نچوڑ ''ترکیب بند'' بر مدرسۃ العلوم واقع علی گڑھ (مرتبہ ۱۸۸۰ع) اور مسلمانوں کی تعلیم (مرتبہ ۱۸۸۹ع) میں موجود ہے - یہ دونوں نظمیں حالی نے محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کے جلسوں میں پڑھیں - ان نظموں میں بدلتے ہوئے حالات کا شدید احساس ہے- افراد کو غفلت اور کاہلی کے قعر مذلت سے باہر نکال کر نئی زندگی سے ہمکنار کرنے کی آرزو ہے- حالی نے جاہ و منصب کے غلط تصورات کے بتوں کو توڑا ہے اور ان کے مقابلے میں تعلیم کے افادی رجحان کو عام کرنے کی کوشش کی ہے- کیونکہ ان کے خیال میں تعلیم ہی قوم کے افراد کو پستی سے نکال سکتی ہے- اس سلسلے میں انہوں نے سر سید کو قوم کی کشتی کا ملاح ثابت کیا ہے- کہیں کہیں وہ سر سید کی اس مخالفت کی طرف بھی اشارہ کرتے ہیں جو ان دنوں ناعاقبت اندیش لوگوں کے ہاتھوں ہورہی تھی- حالی سرسید کو قوم کا حامی اور اسلام کا یاور بتاتے ہیں - کیونکہ سرسید نے قوم کے صحیح مرض کو پہچانا ہے- ان پر چھائی ہوئی تاریکیوں میں اجالا کیا ہے- یہ حقیقت ان کے ذہن نشین کرئی ہے کہ اب حکومت واپس نہیں آسکتی - دنیا میں ہر طرف اب علم و حکمت کے چرچے ہیں - تجارت کی گرم بازاری ہے- اور ان سب کو حاصل کرنے کے لیے تعلیم کی ضرورت ہے - اس لیے تعلیم زندگی کے لیے سب سے زیادہ ضروری ہے- جو لوگ تعلیم سے منہ چرائیں گے ، ان کا نام و نشان اس دنیا سے مٹ

جائے گا۔ حالی ان خیالات سے پوری پوری طرح متفق ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ وہ ان نظموں میں سر سید کا تذکرہ بار بار کرتے ہیں۔

ہمارے شکر سے اے قوم احساس اس کا بالا ہے
کہ جس نے قوم کی تعلیم کا یاں ڈول ڈالا ہے
خدا کی برکت اور رحمت ہو نازل تجھ پہ اے سید
کہ تونے بھائیوں کا ڈوبتا بیڑا سنبھالا ہے
فدائی قوم کے تجھ سے ہی گزرے ہوں گے دنیا میں
کہ دل سوزی کا جن کی آج قوموں میں اجالا ہے

بن آئے قوم کی خدمت تو کیوں کر ہم سے بن آئے
نہ دور اندیشیاں ہم میں نہ خیر اندیشیاں ہم میں
اگر بوجھ اس پہیلی کی نہ سید ہم کو بتلاتا
تو اسلامی اخوت تھی فقط اک چیستان ہم میں
نہ کی سید کے منصوبوں کی گر تائید یاروں نے
تو پھر ہرگز سنبھلنے کی نہیں تاب و تواں ہم میں
بہت مشکل سے ہاتھ آیا ہے منزل کا نشاں یارو
پہنچنے دو سلامت تا بمنزل کارواں یارو!

سرسید نے علی گڑھ کالج کی بنیاد رکھی۔ یہی وجہ ہے کہ حالی نے علی گڑھ کو مسلمانوں کی زندگی کا سرچشمہ قرار دیا ہے۔ اور اس بات کی طرف توجہ دلائی ہے کہ قوم کا نشان اسی گھر سے بلند ہوگا۔ یہیں سے علم و حکمت کے چشمے پھوٹیں گے۔ یہیں سے عمل کی راہیں نکلیں گی۔ اور اس طرح مسلمانوں کے ہاتھوں اسلامی اصول کا بول بالا ہوگا۔ اور اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ علی گڈھ مسلمانوں کا علمی اور تعلیمی مرکز ہے اور تعلیم مسلمانوں کے لیے از بس ضروری ہے— ان کی ساری ترقی کا راز اسی میں مضمر ہے۔

حالی کی معاشی معاشرتی نظموں میں مسدس موسوم بہ ننگ خدمت، اور فلسفۂ ترقی کو

خاص اہمیت حاصل ہے۔ 'ننگ خدمت'، ۱۸۸۷ع میں لکھی گئی۔ اس میں اگرچہ مدو جزر اسلام کا سا سوز و گداز نہیں ہے لیکن حالی نے اس میں ایسی بنیادی حقیقتوں کو پیش کیا ہے۔ جس کی طرف اس زمانے میں افراد کی توجہ مبذول کرانی ضروری تھی۔ حالی نے اس نظم میں انسانی ارتقا کو دکھایا ہے اور اس بات کو واضح کرنے کی کوشش کی ہے کہ ان کی زندگی ہمیشہ ایک سی نہیں رہی۔ آغاز آفرینش میں اگرچہ تہذیب نے ترقی نہیں کی تھی لیکن طبقاتی تفریق کا وجود نہیں تھا۔ کوئی شخص ایک دوسرے کے پاس حاجت روائی کے لیے نہیں جاتا تھا۔ سب اطمینان کی زندگی بسر کرتے تھے، لیکن پھر جور و تغلب کا دور دورہ شروع ہوگیا اور ایک دوسرے کے زیر و زبر کرنے کے لیے ہنگامے ہونے لگے۔ غرض یہ کہ اس طرح ایک غلط نظام بنا۔ جس میں انسانی زندگی انتشار اور پریشانی سے دوچار ہوئی :-

اک زمانہ تھا کہ ہموزن تھے سب خورد و کلاں
لہلہاتی تھی بنی نوع کی کھیتی یکساں
ایک اسلوب پہ تھی گردش پرکار زماں
شہر و ویرانہ و آباد میں تھا ایک سماں
قدر و قیمت میں نہ تھا فرق کسی کی اصلا
کوئی پلا تھا ترازو کا نہ اونچا نیچا

ایک سے ایک نہ کم تھا نہ زیادہ سر مو — سب تھے ہم ایک ترائی کے درخت خود رو
حاجتیں لے کے کسی در پہ گئے تھے نہ کبھو — نہ زمیں بوس کی عادت تھی نہ تسلیم کی خو
دست قدرت کے سوا سر پہ کوئی ہاتھ نہ تھا
اپنا قبلہ تھا کوئی قبلہ حاجات نہ تھا

ناگہاں جور و تغلب کا اٹھا اک طوفاں — جس کے صدمے سے ہوا زیر و زبر نظم جہاں
اقویا ہاتھ ضعیفوں پہ لگے کرنے رواں — بکریوں کو نہ رہی بھیڑیوں سے جائے اماں
تیز دنداں ہوئے جنگل میں غزالوں پہ پلنگ
مچھلیوں پر لگے منہہ کھولنے دریا میں نہنگ

اس صورت حال نے انحطاط و زوال کو عام کیا۔ اور ہر چیز اسی ایک رنگ میں رنگ گئی۔ معاشی بدحالی، انہیں حالات نے پیدا کی۔ اور معاشرتی مذمومات بھی اسی وجہ

سے عام ہوے۔ حالی نے اس نظم میں ان تمام باتوں کی بہت اچھی تصویریں کھینچی ہیں اور آخر میں محنت اور مشقت کی طرف توجہ دلائی ہے۔ غلط نظام کی پیدا کردہ مذمومات کو خیرباد کہنے کے لیے اکسایا ہے۔ پیشے سیکھنے اور ہنر حاصل کرنے کی ترغیب دی ہے کہ اسی طرح حالات بہتر ہوسکتے ہیں اور یہ بدحالیاں ختم ہوسکتی ہیں :—

جن کو منظور ہے مشکل کو نہ دشوار کریں چاہیے سعی و مشقت سے نہ وہ عار کریں
ہو میسر جنھیں وہ خدمت سرکار کریں ورنہ مزدوری و محنت سر بازار کریں
آبرو اس میں ہے سامان اس میں ہے عزت اس میں
فخر اس میں ہے شرف اس میں شرافت اس میں

پیشہ سیکھیں کوئی فن سیکھیں صناعت سیکھیں کشتکاری کریں، آئین فلاحت سیکھیں
گھر سے نکلیں کہیں آداب سیاحت سیکھیں الغرض مرد بنیں جرأت و ہمت سیکھیں
کہیں تسلیم کریں جا کے نہ آداب کریں
خود وسیلہ بنیں اور اپنی مدد آپ کریں

حالی اس سے آگے نہیں سوچ سکتے تھے اور اس زمانے میں اس سے زیادہ سوچنے کی ضرورت بھی نہیں تھی۔ اس وقت حالات کا تقاضا یہی تھا۔ حالی نے بڑی خوبی سے اس مسدس میں اس پہلو کی طرف توجہ دلائی ہے۔

'فلسفۂ ترقی'، ۱۹۰۲ء میں لکھی گئی۔ اس نظم میں بھی حالی نے فلسفۂ ترقی کی منطقی تحصیل کی ہے۔ انسان کی برتری اور ان کے فکر کی بلندی کا احساس دلانے کے بعد حالی نے اس حقیقت کو واضح کیا ہے کہ ہر دور کے اپنے نظریات ہوتے ہیں، اپنا طرز فکر ہوتا ہے، لیکن ان کا تغیر سے ہمکنار ہونا ضروری ہے۔ کیونکہ حالات خارجی طور پر بدلتے رہتے ہیں۔ اس لیے نئے حالات سے مطابقت پیدا کرنے کے لیے اصول بنانا اور ان پر عمل کرنا لازمی ہے۔ اور خصوصاً موجودہ زمانے میں علم تیزی سے ترقی کر رہا ہے اس لیے پرانے نظریات اقوام پارینہ ہوتے جاتے ہیں اور ان کی جگہ نئے خیالات و نظریات کا دور دورہ نظر آتا ہے :—

دوستو! شاید وہ نازک وقت آ پہنچا قریب آ رہی ہے روشنی مغرب سے اک الھتی نظر
اور ترقی کی چلی آتی ہے موجیں مارتی اگلے وقتوں کے نشاں کرتی ہوئی زیر و زبر
دستکاری کو مٹاتی صنعتوں کو روندتی علم و حکمت کی پرانی بستیاں کرتی کھنڈر
ہوشیاروں کو کرشمے اپنے دکھلاتی ہوئی
غافلوں کو موت کا پیغام پہنچاتی ہوئی

حالی کے خیال میں جو شخص اس ترقی کی رو سے مطابقت پیدا نہیں کرتا اس کا زندہ رہنا مشکل ہے :—

بے ترقی ملک میں جینا بہت دشوار ہے وحشیوں کی موت ہے شائستہ قوموں کا عمل

اور اس ترقی کے لیے حالی اتحاد ، حب وطن ، ہمدردی اور قوم کی خدمت کے جذبے کو ضروری قرار دیتے ہیں کہ اس کے بغیر ترقی کا خیال بھی ناممکن ہے۔ حالی نے تاریخی واقعات سے اس حقیقت کو خاصی تفصیل سے واضح کیا ہے۔ حالی کے یہاں تغیر کے عمل کا بڑا گہرا شعور ہے۔ وہ جانتے ہیں کہ ترقی کا نیا نظام پرانے نظام کو ختم کردے گا۔ کیونکہ بغیر اس کے ترقی ناممکن ہے۔

ہے یہ قوموں کی ترقی اور تنزل سے عیاں خود تنزل میں ہے سرچشمہ ترقی کا نہاں
ایک کا جو ہے تنزل دوسرے کا ہے عروج اس کا بکتا ہے مکاں تب اس کی چلتی ہے دکاں
کوئی یاں بنتا نہیں جب تک نہ بگڑے دوسرا گھانس کھدجاتی ہے جب پڑتی ہے تب دھرتی میں دھان
ہوئے ہوتے خشک جب دریا میں جا کر نکلی تب ہوئے نہروں سے مہکی غیرت باغ جناں
چہچہے مرغ چمن کو تب ہوئے جا کر نصیب کرچکا کیڑے مکوڑے جب ہزاروں نوش جاں
جان لو قسمت کسی کی جاگنے والی ہے اب جب سنو بارو کہ رہا کوئی گھر یا خاندان

حالی کی یہ نظم زندگی کا احساس دلاتی ہے۔ انحطاط و زوال کی اصل صورت کو پیش کرتی ہے۔ اور حالات سے مطابقت کا پیغام بھی دیتی ہے۔

حالی کی معاشی اور معاشرتی نظموں میں ایک اور معرکے کی نظم "تعصب و انصاف" (مرتبہ ۱۸۸۲ء) ہے۔ اس میں حالی نے قوم کی حالت کا نقشہ کھینچا ہے اور یہ دکھایا ہے کہ پہلے وہ کیا تھی اور اب کیا ہو گئی ہے۔ انحطاط و زوال نے اس میں بے عملی کو پیدا کیا اور بے عملی نے اسے کہیں کا نہیں رکھا۔ دوسری قومیں ترقی کرتی گئیں کیوں کہ انہوں نے ان چیزوں سے لو لگائی جو ترقی کی منزل سے ہمکنار کرتی ہیں۔ حالی کی اس نظم کو نی میں بڑا درد ہے ، بڑا سوز و گداز ہے۔ اور اس نظم کی یہی سب سے اہم خدمت ہے۔ چند اشعار سے اس کا اندازہ ہوگا :—

یار و اغیار کے عیب اور ہنر　　آشکارا ہوئے اک اک ہم پر
حق کے جلوے نظر آئے ہر جا　　اہل باطل میں بھی اک پائی ادا
ملا ہر راہ میں باطل کا سراغ　　اہل حق کو بھی نہ پایا بے داغ
اہل تقویٰ کی ریائیں دیکھیں　　اہل حکمت کی خطائیں دیکھیں
زشتیاں دیکھیں نکوکاروں میں　　خوبیاں پائیں گنہگاروں میں
کاگ کی پاک سرشتی دیکھی　　پائے طاؤس کی زشتی دیکھی
عیب بھی دیکھے ہنر بھی دیکھے　　خار دیکھے تو ثمر بھی دیکھے
ہنر اغیار میں پائے اکثر　　عیب اپنے نظر آئے اکثر
دفتر علم کو ابتر پایا　　علم کو جہل سے بدتر پایا
مجلسیں غیبت و بہتان سے پر　　صحبتیں جھوٹ سے طوفان سے پر
منقطع بھائی کی بھائی سے امید　　اپنا بیگانہ لہو سب کے سفید
پاک بندوں کی زباں پر دشنام　　نہ ثقات اس سے بری اور نہ کرام
فقرا مکر و ریا کے پتلے　　اغنیا حرص و ہوا کے پتلے
شیخ عیار تو زاہد پر فن　　مولوی عقل کے سارے دشمن
پیاز کی طرح نرے پوست ہی پوست　　قوم کے دوست مگر نادان دوست
حاصل القصہ جو دیکھی اپنی　　کوئی کل پائی نہ سیدھی اپنی
سارے آوے کو ٹٹولا جا کر　　کوئی برتن نہ سڈول آیا نظر
پایا اک دین کا محکم قانون　　وہ بھی یاروں کی بدولت مطعون
دیکھی آنکھوں سے جو یہ حالت زار　　جی بھر آیا نہ رہا صبر و قرار
گو نہ تھا تلخ نوائی کا محل　　آہیں دو چار گئیں دل سے نکل
تلخ گزرے جو کسی کو یہ صدا　　حق میں تلخی کے سوا اور ہے کیا

حالی نے قوم کے انحطاط کی کیسی حقیقت سے بھرپور تصویر کھینچی ہے۔ اس آئینے میں زوال آمادہ قوم کا ہر فرد اپنی صورت دیکھ سکتا ہے۔

غرض یہ کہ اسی طرح کی بہت سی نظمیں حالی کے یہاں ملتی ہیں۔ رحم و انصاف،

واعظ و شاعر اور دولت و وقت وغیرہ کے جو مختلف مناظرے انہوں نے لکھے ہیں ان کا بنیادی موضوع بھی اسی طرح کی باتیں ہیں۔ حالی کا یہ محبوب موضوع ہے۔ وہ اسی کے شاعر ہیں۔

(۹)

حالی کے یہاں گہری سنجیدگی اور شدید احساس ہے۔ اسی چیز نے انہیں قومی شاعر بنایا ہے، لیکن حالی کبھی کبھی اس دائرے سے باہر بھی نکلے ہیں اور زندگی کی عام دلچسپیوں میں انہوں نے حصہ بھی لیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ انہوں نے بچوں کے لیے عام دلچسپی کی نظمیں لکھی ہیں۔ ان نظموں کو اردو میں اولیت حاصل ہے۔ عام طور پر اس سے قبل کسی اردو شاعر نے بچوں کے لیے نظمیں نہیں لکھیں — حالی بچوں کے پہلے شاعر ہیں۔ انہوں نے اس کی بنیاد رکھی۔ ایک راستہ بنایا اور آئندہ دوسرے شاعر اس راستے پر چلے۔

بچوں کے لیے جو نظمیں حالی نے لکھی ہیں ان میں بھی حالی کی سنجیدگی اپنا اثر دکھاتی ہے۔ ان کی طبیعت کا افادی رجحان اس میں بھی اپنی جھلک دکھاتا ہے، لیکن مجموعی اعتبار سے دیکھا جائے تو حالی نے اس موضوع سے مطابقت پیدا کرنے کے سلسلے میں اپنے آپ کو کچھ نہ کچھ بدلا ہے۔ ان نظموں میں وہ بچوں سے گھلتے ملتے نظر آتے ہیں۔ ان کی نفسیات کو سمجھتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ ان کے مسائل کو سلجھاتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ ان کو ایک نئی زندگی سے روشناس کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ یہاں ان کا سوز و گداز باقی نہیں رہتا، بلکہ ایک شگفتگی آجاتی ہے۔ اداسی اور سوگواری کی جگہ ایک دلچسپی کا ماحول پیدا ہوجاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ حالی کی یہ نظمیں مؤثر بھی ہیں اور بچوں کے لیے دلچسپی کا سامان بھی فراہم کرتی ہیں۔ لیکن اس طرح کہ انہیں زندگی کی حقیقت بھی معلوم ہوتی ہے۔ وہ اس کو سمجھتے ہیں اور سمجھ کر برتنے کی کوشش کرتے ہیں۔

ان نظموں کے موضوعات مختلف اور متنوع ہیں۔ خدا کی شان، 'بڑوں کا حکم مانو، 'مرغی اور اس کے بچے'، 'بلی اور چوہا'، 'شیر کا شکار'، 'پیشے'، ''گھڑیاں اور گھنٹے''، 'دھان بونا'، 'روٹی کیونکر میسر آتی ہے'، 'موچی'، 'چٹھی رساں'، 'سپاہی'، 'ایک چھوٹی بچی کے خصائل'، — یہ عنوانات متنوع ہیں۔ لیکن ان سب میں ایک بات مشترک ہے — وہ

یہ کہ ان سب میں حالی نے بچوں سے کچھ نہ کچھ کہنے اور ان کو کچھ نہ کچھ بتانے اور سمجھانے کو اپنے پیش نظر رکھا ہے — چنانچہ بچے ان نظموں سے بہت کچھ سیکھتے ہیں - زندگی میں مختلف پہلوؤں سے ان کی واقفیت بڑھتی ہے — اور ان کے اندر ان کا صحیح احساس اور شعور پیدا ہوتا ہے -

' خدا کی شان ' بچوں کے اندر خدا کی ذات کا صحیح احساس پیدا کرتی ہے - ان کا یہ عقیدہ پختہ سے پختہ تر ہوجاتا ہے کہ خدا کی ذات اس زندگی میں ہر چیز کو پیدا کرنے والی ہے - اور ہر چیز کو پیدا کرنے میں اس کی ایک مصلحت بھی ہے :—

اے زمین آسمان کے مالک　　ساری دنیا جہان کے مالک
تیرے قبضے میں سب خدائی ہے　　تیرے ہی واسطے بڑائی ہے
توہی ہے سب کا پالنے والا　　کام سب کا نکالنے والا
بھوک میں تو ہمیں کھلاتا ہے　　پیاس میں تو ہمیں پلاتا ہے
آنکھ دی تونے دیکھنے کے لیے　　کام کرنے کو ہاتھ پاؤں دیے
بات کے سننے کو دئے دو کان　　بات کہنے کو تونے بخشی زبان
دن بنایا کمائی کرنے کو　　رات دی تونے نیند بھرنے کو
آئی موسم سے تنگ جب خلقت　　تو نے موسم کی دی بدل صورت
گرمیاں ہوگئیں اجیرن جب　　تو نے برسات بھیج دی یارب
سب کے گرمی سے تھے خطا اوسان　　مینہ برسنے سے آئی جان میں جان
گئے جب مینہ سے لوگ سب گھبرا　　حکم سے تیرے چل پڑی پچھوا
یا تو تھیں ساری چیزیں سیل رہیں　　یا رہا سیل کا نہ نام کہیں
جاڑا آ پہنچا اور گئی برسات　　دم کے دم میں پلٹ گئے دن رات
پھر لگی پڑنے جب بہت سردی　　مشکل آسان تو نے پھر کردی
جاڑا آخر ہوا اور آئی بہار　　جنگل اور ٹیلے ہوگئے گلزار
تو یونہی رت بہ رت بدلتا رہا　　یونہی دنیا کا کام چلتا رہا
کیں سدا تو نے مشکلیں آساں　　تیری مشکل کشائی کے قربان

بظاہر یہ خدا کی شان کا بیان ہے، لیکن خدا کی شان کے اس بیان میں ایک افادی پہلو بھی ہے — اور وہ یہی ہے کہ اس سے بچوں کے دل میں خدا کی بڑائی، بلندی اور برتری کا احساس پیدا ہوتا ہے۔ وہ یہ محسوس کرتے ہیں کہ اس دنیا کا سارا کارخانہ اسی کے ہاتھوں چل رہا ہے۔ کہیں کہیں وہ اس بات کا احساس بھی دلاتے ہیں کہ یہی خدا ہماری حفاظت کرتا ہے — اور یہ خیال مرغی اور اس کے بچوں کو دیکھ کر ان کے ذہن میں آتا ہے۔ چنانچہ مرغی اور اس کے بچے میں اس کی تفصیل پیش کرنے کے بعد اس خیال کا اظہار کرتے ہیں:

مرغی جس طرح کہ ان بچوں کی کرتی ہے شام و سحر رکھوالی
بس اسی طرح سمجھ لو کہ خدا ہے ہماری بھی حفاظت کرتا

اور اس طرح حالی نے بچوں میں مذہبی قدروں کو عام کرنے کی کوشش کی ہے اور اس میں وہ کامیاب ہیں۔

ان نظموں میں کہیں کہیں حالی کے پیش نظر اخلاقی پہلو بھی رہا ہے۔ وہ بچوں کو اس بات کی تاکید کرتے ہیں کہ وہ بڑوں کا حکم مانیں اور ان بڑوں میں استاد اور ماں باپ سب ہی شامل ہیں:

سیکھو گے علم و حکمت ان کی ہدایتوں سے پاؤ گے مال و دولت ان کی نصیحتوں سے
پھولو گے اور پھلو گے ان کی ملامتوں سے چاہو اگر بڑائی کہنا بڑوں کا مانو

کہیں کہیں بچوں میں ہمت بھی پیدا کرتے ہیں۔ شیر کا شکار میں وہ جب یہ کہتے ہیں:

لو دیکھو وہ دبکا دبکا بھیڑوں کے ریوڑ میں جا پہنچا
شیر اور اس پر بھوک میں جھلا کر ہی لیا اک بھیڑ کو لقما
ٹوک کے اور للکار کے اس کو
جائیں گے ہم بھی مار کے اس کو

تو اس کا مقصد یہی ہوتا ہے

کبھی بچوں کو کام کرنے کی طرف رغبت دلاتے ہیں۔ " گھڑی اور گھنٹے " میں جب وہ یہ کہتے ہیں:—

کیا ان کی بساط اور کیھو کیا ان کی ہے اوقات   جانے دو اگر ان میں نہیں کوئی کرامات
انصاف کرو تو ہے یہی کتنی بڑی بات   جس کام کے ہیں اس میں لگے رہتے ہیں دن رات

ہیں چلنے میں تھکتے نہ ٹھٹکتے نہ بچلتے
جس راہ پہ دو ڈال اسی راہ ہیں چلتے

تو اُن کی مراد یہی ہوتی ہے۔

حالی بچوں میں زندگی کا صحیح احساس بھی پیدا کرنا چاہتے ہیں اور یہ احساس زندگی کو بہتر طور پر برتنے اور بسر کرنے کے لیے ضروری ہے۔ چنانچہ "پیشے" میں انہوں نے اس خیال کو پیش نظر رکھا ہے۔ بچوں کو زندگی کے نظام میں ایک بہتر فرد بنانے کی طرف توجہ دلائی ہے۔ جب بچہ اس نظم میں یہ کہتا ہے:

میں بڑا ہوں گا جب تو اماّں جان   اپنے مقدور بھر بنوں گا کسان

تم نے مجھ کو اگر اجازت دی   فوج میں جا کے ہوں گا میں بھرتی

گھر میں بیٹھا رہوں نہ یوں خالی   آپ کے باغ کا بنوں مالی

جب کہ ہوں گا بڑا تو اے حضرت   لوں گا کوئی پولس کی میں خدمت

میں بڑا ہوں گا جب کہ بی اماں   ہوسکا تو بنوں گا چٹھی رساں

جب کہ اماں جوان ہوں گا میں   اک بڑھئی مستری بنوں گا میں

تو حالی کی مراد یہ ہوتی ہے کہ بچوں کو کسی پیشے سے نفرت نہیں کرنی چاہئے۔ بلکہ ہر پیشے کو اپنے مزاج کی مناسبت سے حاصل کرنے کی کوشش کرنی چاہئے — اور یہ کام اس لئے ہونا چاہیے کہ وہ زندگی کی کشمکش میں اپنے ماں باپ کا ہاتھ بٹاسکیں — چناں چہ

" روٹی کس طرح میسر آتی ہے "، وہ اس موضوع کی ساری تفصیل بیان کرنے کے بعد بھی کہتے ہیں :

سبق ماں باپ سے یہ سیکھ رکھو — بڑے ہوکر یہی کرنا ہے تم کو
مزہ جب ہے کہ ہاتھ ان کا بٹاؤ — بڑے ہوکر تم ان کے کام آؤ
کبھی ہونا نہ تم سست اور کاہل — لگانا اپنے اپنے کام میں دل
نہ ڈھیلی چھوڑنا تم اپنی ڈوری — سمجھنا جی چرانے کو بھی چوری

اور یہ زندگی کی ایک اہم حقیقت ہے — خصوصاً متوسط طبقے کے اس ماحول میں جس نے حالی کو پیدا کیا تھا اور جس کے مسائل کو حالی خوب سمجھتے تھے ۔

بچوں کی نظموں کا یہ انداز جو حالی نے پیش کیا بالکل نیا تھا ۔ ان نظموں میں بھی زندگی کو بدلنے اور اس کو سنوارنے کا احساس موجود ہے لیکن ان کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ اس افادی رجحان کے نمایاں ہونے کے باوجود وہ بچوں کے لئے دلچسپ ہیں کیونکہ وہ بچوں کی نفسیات کے گہرے شعور کے ساتھ لکھی گئی ہیں ۔

حالی اس اعتبار سے بھی اردو نظم نگاری میں منفرد ہیں !

(۱۰)

حالی کی نظموں کا جوہر ان کی افادیت ہے ، لیکن اس افادیت کو پیش کرنے کے سلسلے میں ان کے یہاں فلسفیانہ گہرائی پیدا نہیں ہوتی ۔ حالی فلسفی اور مفکر نہیں تھے ۔ لیکن حالات کے صحیح نباض اور مزاج دان ضرور تھے ۔ ان کے یہاں افسانہ کی شدت تھی ۔ یہی وجہ ہے کہ جذبات ان پر غالب آجاتے تھے ۔ فلسفہ اس احساس کی شدت اور جذباتی انداز کا ساتھ نہیں دے سکتا ۔ چنانچہ حالی کی نظموں میں فلسفیانہ گہرائی کے بجائے احساس کی شدت سے پیدا ہونے والا سوز و گداز ضروری ہے ۔ وہ حالات کو صحیح سمجھتے ہیں ۔ ان کی اہمیت بھی ذہن نشین کرادیتے ہیں ، لیکن ان حالات کی فلسفیانہ تحلیل اور منطقی تجزیہ ان کے یہاں نہیں ہوتا ۔ ان حالات کو بہتر بنانے کی طرف وہ ضرور توجہ کرتے ہیں ۔

بلکہ یہ کہنا بے جا نہیں کہ ان کی ساری نظمیں اسی خیال کو سامنے رکھ کر لکھی گئی ہیں ۔ یہی وجہ ہے کہ افادی پہلو ان میں بہت نمایاں ہے ۔ حالی کی شخصیت ان میں پوری طرح بے نقاب ہے ۔ حالی جو کچھ سوچتے تھے ، جو کچھ محسوس کرتے تھے ، جو بھی ان کے اصول اور نظریات تھے ، ان سب کا عکس ان نظموں میں نظر آتا ہے ۔ حالی کا زاویۂ نظر عصری اور اصلاحی تھا ۔ اس لیے ان کی یہ نظمیں بھی انہیں خصوصیات کی حامل ہیں ۔ ان میں زندگی کو سنوارنے اور بہتر بنانے کا احساس زیادہ ہے ، اس کے مختلف پہلوؤں پر غور و فکر کی گئی ہے ۔

یہ نظمیں عصری نوعیت کی ہیں ۔ یہی وجہ ہے کہ ان میں عصری میلانات کی ترجمانی اور عکاسی پوری طرح موجود ہے ۔ یہ سب کی سب سرسید کی تحریک کے زیر اثر لکھی گئی ہیں ۔ اس لیے ان میں سرسید کے بنیادی خیالات و نظریات احساس کی شدت میں سمو کر ، اپنی جذباتی انداز میں پیش کردیے گئے ہیں ۔ چنانچہ اس دور کے تمام رجحانات کا عکس ان نظموں میں موجود ہے ۔ حالی اس دور کے مختلف پہلوؤں کے بارے میں جو نقطۂ نظر رکھتے تھے وہ ان نظموں سے پوری طرح نمایاں ہوتا ہے ۔

حالی نے سیاسی موضوعات پر نظمیں نہیں لکھی ہیں لیکن ان نظموں سے ان کے سیاسی نظریات کی وضاحت ہوتی ہے ۔ وہ سیاسی آدمی نہیں تھے لیکن مسلمان کو سیاسی اعتبار سے بلند مرتبہ دیکھنا چاہتے تھے ۔ غدر کے بعد کی سیاست میں کوئی انتہا پسندی نہیں تھی ۔ اس وقت مسلمانوں کے لیے یہی ایک راستہ تھا کہ وہ انگریزوں سے مصالحت کرلیں اور ان کی دوستی کا دم بھرنے لگیں ۔ سرسید اس کے حامی تھے ۔ لیکن ایک گروہ ان کی مخالفت پر تلا ہوا تھا ۔ یہ لوگ انگریزوں سے مصالحت کرنے کے لیے تیار نہیں تھے ۔ حالی سرسید کے ہم نوا تھے ۔ اس لیے انگریز دوستی ان کے نزدیک وقت کا تقاضا تھی ۔ چنانچہ انہوں نے بار بار اس کا اظہار کیا ہے کہ مسلمانوں کی تمام بیماریوں کا علاج اسی ایک بات میں ہے کہ وہ سرسید کا ساتھ دیں اور جو راستہ وہ دکھارہے ہیں اس پر گامزن ہوں ۔ چنانچہ ان کی سیاست میل جول کی سیاست ہے ۔ زمانے سے مصالحت کی سیاست ہے ۔ انہوں نے بار بار اس بات کا اظہار کیا ہے کہ مسلمانوں کو اپنے پیروں پر کھڑا ہونا چاہیے اور وہ اسی طرح کھڑے ہوسکتے ہیں کہ اپنے

آپ کو نئے نظام سے مطابق کرلیں ۔ حالی کا میدان معاشرتی اصلاح تھا ۔ اور بغیر اس مطابقت اور مصالحت کی فضا کو پیدا کئے وہ اس پروگرام کو عملی جامہ نہیں پہنا سکتے تھے ۔

انگریزوں سے اس مطابقت اور مصالحت کا مطلب یہ نہیں تھا کہ حالی مسلمانوں کی سیاسی اہمیت کا شعور نہیں رکھتے تھے ۔ ان کی نظموں میں مسلمانوں کے ایک قوم ہونے کے احساس جگہ جگہ ملتا ہے ۔ اپنی نظموں میں قومی انفرادیت کا تذکرہ وہ بار بار کرتے ہیں ۔ یہی وجہ ہے کہ مسلمانوں کی ترقی کا احساس ان نظموں میں نمایاں ہے ۔ وہ کہیں اس قوم کی زبوں حالی پر روتے ہیں ، کہیں ماضی کی شاندار روایات کا احساس دلاکر ان کی روشنی میں ترقی کی راہ پر آگے بڑھنے کے لیے اکساتے ہیں ۔ ان سب باتوں کو پیش کرنے میں اسلامی نظام کا لائحہ عمل ان کے پیش نظر رہتا ہے ۔ اس کے ساتھ ہی ساتھ حالی کی نظموں میں حب وطن اور وطن پرستی کا شدید احساس بھی ملتا ہے اور وہ اس کو قوم کی ترقی کے لیے ضروری سمجھتے ہیں ۔ وہ اتحاد و اتفاق کے نغمے بھی گاتے ہیں ۔ ہمدردی اور محبت کا پیام بھی دیتے ہیں ۔

حالی کی سیاست مسلمانوں کی سیاست ہے ۔ وہ خود بھی سچے اور مخلص مسلمان ہیں ۔ انہیں مسلمان قوم کا خیال بھی سب سے زیادہ ہے ، لیکن اس کے باوجود وہ ہندوستانی بھی ہیں ۔ ہندوستانی ہونے کا شدید احساس ان کی نظموں میں نمایاں ہے ۔ اور وہ قومی زندگی اور اس کی ترقی کے لیے اس ہندوستانیت کو ضروری سمجھتے ہیں ۔ چنانچہ ہندوستان کی ہر چیز سے ان کے یہاں گہری دلچسپی ملتی ہے ۔ یہاں تک کہ وہ خود اپنی نظموں کے انداز بیان میں بڑی حد تک ہندوستانی رنگ پیدا کردیتے ہیں ۔

اس سیاست میں سماجی اصلاح کو بنیادی حیثیت حاصل ہے ۔ حالی کی سیاست سوائے اس کے اور کچھ نہیں ۔ چنانچہ ان سیاسی نظریات کا سہارا لے کر وہ ساری سماجی زندگی کو بدلنا چاہتے ہیں ۔ اس کے ہر شعبے میں زندگی کی ایک لہر دوڑانا چاہتے ہیں ۔ انحطاط و زوال کے باعث جن مذمومات نے سماجی زندگی میں گھر کرلیا ہے ، حالی ان کو ختم کرنے کے خواہشمند ہیں ۔ وہ پرانی روایات کی اہمیت کے قائل ہیں لیکن جو روایات قوم کو سلاتی ہیں ان کو پسند نہیں کرتے ۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی نظموں میں ایک عمل کا پیام ملتا ہے ۔ آگے بڑھنے کے لیے ایک للکار سنائی دیتی ہے ۔ وہ افراد کے انداز کو بدلنا چاہتے ہیں ۔ ان کے رسوم و رواج

کو بدلنا چاہتے ہیں ۔ اطوار و عادات کو بدلنا چاہتے ہیں ۔ افکار و خیالات کو بدلنا چاہتے ہیں اور ان سب کی جگہ لینے کے لیے ان کے پاس نئی اقدار ہیں ، زندگی بسر کرنے کا نیا انداز ہے ، سوچنے اور غور کرنے کا نیا طریقہ ہے ۔ غرض یہ کہ حالی کی ان نظموں میں یہ سب موجود ہے ۔

اس سلسلے میں سب سے زیادہ جس چیز کی طرف حالی اپنی نظموں میں توجہ کرتے ہوئے نظر آتے ہیں وہ تعلیم ہے تعلیم انسان کو صحیح معنوں میں انسان بناتی ہے ۔ اسے صحیح راستوں پر گامزن کرتی ہے ۔ چنانچہ وہ اپنی نظموں میں بار بار تعلیم کے اس نئے نظام کی طرف توجہ دلاتے ہیں جو سرسید کی تحریک کے زیر اثر عام ہورہا تھا ۔ تعلیم کے نئے سے نئے نظریات حالی نے اپنی نظموں میں پیش کئے ہیں ۔ وہ اسی تعلیم کے قائل ہیں جو علم کا شوق پیدا کرتی ہے ۔ جس سے ایک علمی ماحول پیدا ہوتا ہے ۔ جس سے انسان میں تہذیبی خصوصیات نمایاں ہوتی ہیں اور وہ قوم کا ایک اچھا فرد بنتا ہے ۔ قوم اس کے سہارے آگے بڑھتی ہے اور تہذیبی ، معاشی، معاشرتی اعتبار سے ترقی کرتی ہے ، لیکن حالی اپنے آپ کو اسی تعلیم تک محدود نہیں کرتے وہ ہنر حاصل کرنے کی ترغیب دلاتے ہیں ۔ ہنر کا حاصل کرنا ترقی کے لیے ازبس ضروری ہے ۔ اس ہنر سے افراد مختلف پیشے اختیار کرسکتے ہیں ۔ اور اس کے بغیر سماجی ترقی ناممکن ہے ۔ انحطاط و زوال کے زیر اثر جو ایک خیال یہ عام ہوگیا تھا کہ مختلف پیشے شرفا کے شایان شان نہیں ۔ اس خیال نے جس بے کاری اور بے عملی کو قوم میں عام کیا تھا حالی اس کے سخت خلاف تھے ۔ ان کے خیال میں صحیح تعلیم ہی اس طرح غلط خیالات کو ختم کرسکتی تھی ۔ چنانچہ نہایت تفصیل سے جگہ جگہ حالی نے اپنی نظموں میں اس طرح خیالات پیش کئے ہیں ۔

حالی کے یہاں مذہبی اقدار کا احساس بڑا گہرا ہے ۔ وہ مذہب کے بنیادی اصولوں کو انسانی زندگی کی ترقی کے لیے بہت ضروری سمجھتے ہیں ۔ مذہب انسان کو صحیح زندگی بسر کرنا سکھاتا ہے اور معاشرتی اعتبار سے بھی نئی زندگی بخشتا ہے ۔ حالی نے مذہب کا جو تصور پیش کیا ہے وہ عقلی اور سائنٹفک ہے ۔ وہ مذہبی اصول کی سماجی اور معاشرتی اہمیت کے قائل ہیں ۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی مذہبیت کا تصور قومی حیثیت اختیار کرلیتا ہے ۔ حالی کی

اخلاقی اقدار بھی مذہب کے تابع ہیں ۔ انہیں جگہ جگہ مذہب کا سہارا لینا پڑتا ہے۔ لیکن اس کے سہارے انہیں آگے بڑھنے میں آسانی ہوتی ہے۔ حالی کی نظموں میں جگہ جگہ یہ پہلو نمایاں ہوتا ہے۔

یہ تمام باتیں حالی نے اپنی نظموں میں ایک رجائی زاویۂ نظر سے پیش کی ہیں۔ حالی نے قوم کی زبوں حالی پر اگرچہ خون کے آنسو بہائے ہیں، اس کی کس‌مپرسی کا مرثیہ لکھا ہے، لیکن ان کی نظمیں اس کے باوجود زندگی کا ایک احساس پیدا کرتی ہیں، اس کو بہتر بنانے کی طرف توجہ دلاتی ہیں ۔ ترقی کرنے کا خیال ان کی نظموں میں جگہ جگہ نمایاں ہوتا ہے۔ یہی خیال ان کی نظموں کی بنیادی خصوصیت ہے۔ اور اسی نے ان میں افادیت کا رنگ بھرا ہے۔ چنانچہ حالی کی نظموں کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ وہ ایک پیام کی حامل ہیں ۔ اس پیام میں ایک رجائیت ہے — البتہ اس کو پیش کرنے میں فلسفیانہ گہرائی کا پتہ نہیں چلتا ۔ احساس کی شدت اور جذبے کی فراوانی بے شک نظر آتی ہے۔ چنانچہ ان میں ایک سوز و گداز اور درد بھی پیدا ہوجاتا ہے۔ لیکن حالی عقلی زاویۂ نظر کو کہیں بھی نظر انداز نہیں کرتے — ان کی نظموں کی بڑائی کا راز انہیں خصوصیات میں مضمر ہے۔

(۱۱)

حالی کی نظموں کے بارے میں ایک عام خیال یہ ہے کہ وہ جہاں تک شاعرانہ خوبیوں کا تعلق ہے، سپاٹ ہیں۔ ان میں وہ رنگینی نہیں جو شاعری کو صحیح معنوں میں شاعری بناتی ہے۔ ان میں وہ آرائش و زیبائش نہیں، جن کے بغیر شاعری میں پھیکے پن کا احساس ہوتا ہے۔ لیکن یہ خیال صحیح نہیں ہے۔ آزاد کی نظموں کے بارے میں یہ خیال صحیح ہوسکتا ہے کیونکہ وہ واقعی سپاٹ ہیں — ان میں وہ دلکشی نہیں جو تخیل اور جذبے کی آمیزش سے پیدا ہوتی ہے۔ لیکن حالی کے یہاں ان دونوں چیزوں کی فراوانی ہے— تخیل اور جذبہ جو رنگینی شاعری میں پیدا کرسکتا ہے وہ حالی کی نظموں میں بھی نمایاں ہوتی ہے۔ لیکن ان میں آرائش و زیبائش کا احساس کم ہے اور اس کا سبب یہی ہے کہ حالی اس دنیا کے انسان نہیں تھے۔ تکلف اور تصنع سے انہیں دور کا تعلق بھی نہیں تھا — چنانچہ وہ دلکشی پیدا کرنے کے لیے اہتمام نہیں کرتے ۔ شاعرانہ خوبیاں پیدا کرنے کے لیے وہ محنت کے قائل

نہیں ہیں — آورد کو وہ اچھا نہیں سمجھتے ۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی نظمیں تکلف ، تصنع اور آورد سے پاک ہیں ۔ ان میں ایک بے ساختگی (Spontaneity) کا احساس ہوتا ہے ۔ ایک سادگی نظر آتی ہے ، ایک سیدھا سادھا پن نمایاں ہوتا ہے ، اور انہی تمام عناصر میں شعریت اپنے آپ کو نمایاں کرتی ہے — ان کی نظموں میں شعریت ہے لیکن اس شعریت کو حالی کی شخصیت ، ان کا مزاج اور ان کے نقطۂ نظر کی روشنی ہی میں سمجھا اور محسوس کیا جاسکتا ہے ۔

سنجیدگی اور ثقاہت حالی کی شخصیت کی سب سے نمایاں خصوصیات ہیں چنانچہ ان کے آرٹ میں بھی خصوصیات کا عکس نظر آتا ہے ۔ ثقاہت اور سنجیدگی ان کی نظموں کی امتیازی خصوصیات ہیں ۔ حالی اپنی نظموں میں سب لئے دئیے رہنے والا انداز اختیار کرتے ہیں ۔ ان کی شخصیت میں جو ایک بزرگانہ شان تھی وہ ان کی نظموں میں بھی نظر آتی ہے ۔ تمام نظموں کے پیچھے ایک بزرگ شخصیت ، اور اس کی سنجیدگی کا اثر صاف نمایاں ہوتا ہے ۔ البتہ اس سنجیدگی کے ساتھ بے پایاں خلوص کی آمیزش ہے ۔ یہی وجہ ہے کہ یہ نظمیں باوجود اپنی سنجیدگی اور خشکی کے دل میں اتر جاتی ہیں ۔ پھر حالی کا جو موضوع ہے اس میں اس سنجیدگی اور ثقاہت کا ہونا لازمی تھا ۔ حالی کے موضوع میں بذات خود ایک عظمت اور بڑائی ہے ۔ ایک ثقاہت اور سنجیدگی ہے ۔ ایک درد اور سوز و گداز ہے ۔ چنانچہ یہی خصوصیات منظومات حالی کے شاعرانہ انداز میں بھی موجود ہیں ۔ دوسرا انداز شاید تاثر کی یہ کیفیت ان کی نظموں میں نہ پیدا کرسکتا ۔ حالی نے اپنی نظموں میں ان خصوصیات کو پیدا کرکے مواد اور ہیئت کی ہم آہنگی کے گہرے شعور کا اظہار کیا ہے ۔ ان کی نظموں میں ہر جگہ مواد اور ہیئت کی ہم آہنگی اور مناسبت نظر آتی ہے اور اسی کا یہ نتیجہ ہے کہ ان کے شاعرانہ معیار بھی مخصوص ہیں ۔ ان میں تکلف نہیں ہے ۔ تصنع نہیں ہے ۔ شگفتگی کا احساس بھی ان میں نہیں ہوتا ۔ شوخی اور بے باکی بھی نظر نہیں آتی ۔ برخلاف اس کے سنجیدگی اور ثقاہت ، خلوص اور صداقت کے عناصر ملتے ہیں ۔ حالی کی شخصیت اور ان کے موضوع میں جب رنگینی ، رعنائی اور شگفتگی نہیں تھی تو بھلا ان کے انداز میں یہ عناصر کہاں سے آتے ؟

حالی کی شعریت کے معیار مختلف ہیں ۔ وہ شعریت کے لیے سادگی ، اصلیت اور جوش کو

ضروری قرار دیتے ہیں اور یہ خصوصیات وہ خلوص ہی پیدا کرسکتا ہے جو شاعر کو اپنے موضوع کے ساتھ ہونا چاہئے۔ حالی کے احساس کی شدت اپنے موضوع کے ساتھ اس خلوص کو پیدا کرتی ہے ، یہی وجہ ہے کہ ان کی نظموں میں سنجیدگی اور ثقاہت کے ساتھ ساتھ اصلیت ، سادگی اور جوش کا شدید احساس ہوتا ہے۔ اور یہی خصوصیات ان کی نظموں میں حقیقت و واقفیت کا رنگ بھرتی ہیں۔ حالی ایک حقیقت نگار ہیں ، ایک فطرت پرست ہیں اور ان کا فن بھی اسی حقیقت نگاری اور فطرت پرستی سے عبارت ہے۔ یہ حقیقت نگاری اور فطرت پرستی ان کی نظموں کو ایک خاص طرح کے جمالیاتی تاثر سے معمور کرتی ہے۔ اور اس کا احساس ہر جگہ ہوتا ہے :

دوستو ! شاید وہ نازک وقت آ پہنچا قریب ‌‌ ‌ آ رہی ہے روشنی مغرب سے اک اٹھتی نظر
رو ترقی کی چلی آتی ہے موجیں مارتی ‌ ‌ ‌ اگلے وقتوں کے نشاں کرتی ہوئی زیر و زبر
دستکاری کو مٹاتی ، صنعتوں کو روندتی ‌ ‌ ‌ علم و حکمت کی پرانی بستیاں کرتی کھنڈر

(فلسفۂ ترقی)

اگر رکھتے ہیں دل پہلو میں آکر یہ چمن دیکھیں ‌ ‌ ‌ ریاض قوم کا فصل خزاں میں بانکپن دیکھیں
وطن کو جو سمجھتے ہیں کہ ہے ترجیح غربت پر ‌ ‌ ‌ وہ آکر شام غربت بہتر از صبح وطن دیکھیں

(مسلمانوں کی تعلیم)

اے راست گزینی اے تیغ براں ‌ ‌ ‌ تیرا مخالف کیوں ہو نہ دوراں
سب وحشت آگیں مضموں ہیں تیرے ‌ ‌ ‌ نت مصلحت پر شب خوں ہیں تیرے
کن تیرے جن پر ظاہر ہوئے ہیں ‌ ‌ ‌ وہ تیری دھن میں آخر ہوئے ہیں
املا جہاں سے سیلاب تیرا ‌ ‌ ‌ پھر واں نہ کشتی ٹھہری نہ بیڑا
اٹھتی ہیں دل سے جب تیری موجیں ‌ ‌ ‌ ہوتی ہیں نازل واں حق کی فوجیں
دیتی ہے ہمت ان کو سہارے ‌ ‌ ‌ کرتی ہے امید پنہاں اشارے

(کلمتہ الحق)

بارک اللہ! اے ریاض علم اے عین الحیات — ہے ہمارے بخت و دولت کی عناں اب تیرے ہات
ہو تو ہو اب روشنی تیری دلیل کارواں — چار سو کالی گھٹا چھائی ہے اور کالی ہے رات
قوم عد تو بھی یونہی جہل اور تعصب کو مٹا — جس طرح دین خلیلی سے مٹے لات و منات
چھوڑ جائیں گے جہاں میں جو کہ تجھ جیسے نشاں — چھوڑ جائیں گے وہی کچھ باقیات الصالحات

ایک باہمت جماعت جب سے تیرے ساتھ ہے
ہم سمجھتے ہیں ترے سر پر خدا کا ہات ہے

(ترکیب ہند بر مدرسۃ العلوم)

اب عزیزو جز رسی کا اور کفایت کا ہے وقت — ہے تمہارا مدتوں لوٹا ہوا اک کارواں
آج کل ہے بس یونہی امداد کی محتاج قوم — قحط میں پانی کی بھوکی جیسے بارو کھیتیاں

(انجمن حمایت اسلام)

وہ دیکھے گا ہر سو ہزاروں چمن واں — بہت تازہ تر صورت باغ رضواں
بہت ان سے کمتر پہ سرسبز و خنداں — بہت خشک اور بے طراوت مگر ہاں

نہیں لانے گو برگ و بار اُن کے پودے
نظر آتے ہیں ہونہار اُن کے پودے

پھر اک باغ دیکھے گا اجڑا سراسر — جہاں خاک اُڑتی ہے ہر سو برابر
نہیں تازگی کا کہیں نام جس پر — ہری ٹہنیاں جھڑ گئیں جس کی جل کر

نہیں پھول پھل جس میں آنے کے قابل
ہوئے روکھ جس کے جلانے کے قابل

جہاں زہر کا کام کرتا ہے باراں — جہاں آ کے دیتا ہے رو ابر نیساں
تردد سے جو اور ہوتا ہے ویراں — نہیں راس جس کو خزاں اور بہاراں

یہ آواز پیہم وہاں آرہی ہے
کہ اسلام کا باغ ویران یہی ہے

وہ دین حجازی کا بے باک بیڑا — نشاں جس کا اقصائے عالم میں پہنچا
مزاحم ہوا کوئی خطرہ نہ جس کا — نہ عماں میں ٹھٹکا نہ قلزم میں جھجکا

کیے پے سپر جس نے ساتوں سمندر
وہ ڈوبا دہانے میں گنگا کے آکر

(مسدس)

یاد ایام کہ نے رنگ تھی تصویر جہاں دست مشاطہ نہ تھا محرم زلف دوراں
گل خود رو سے بسا تھا چمن کون و مکاں چار سو حسن خدا داد کا سکہ تھا رواں
وضع عالم میں نہ آیا تھا تغیر اب تک
خط قدرت کی وہی شان تھی اور نوک پلک

طفل معصوم کی مانند تھا یہ عالم پیر تھے ہم اک صنعت بے چون و چرا کی تصویر
ملک فطرت میں نہ تھی سلطنت نفس شریر طمع نے مملکت روح نہ کی تھی تسخیر
خواب غفلت کی گھٹا دل پہ نہ چھائی تھی بہت
دن چھپا تھا ابھی اور رات نہ آئی تھی بہت

ان سب میں شعریت کا کیسا رچا ہوا انداز ملتا ہے۔ اور حالی کی نظموں میں اس انداز کی کمی نہیں ہے۔ حالی کی ثقاہت اور سنجیدگی کا احساس لوگوں پر اتنا غالب رہتا ہے کہ ان کی نظریں حالی کی نظموں کے اس رچے ہوئے انداز بیان کو دیکھنے سے قاصر رہ جاتی ہیں۔

حالی کی نظمیں شعریت سے بھرپور ہیں۔ یہ شعریت مختلف عناصر سے تشکیل پاتی ہے حالی کہیں تشبیہوں اور استعاروں سے کام لیتے ہیں۔ لیکن یہ تشبیہیں اور استعارے بھی صرف رنگینی پیدا کرنے کے لیے نہیں ہوتے۔ حالی ان کے پردے میں کچھ کہنا چاہتے ہیں۔ کسی بات کی وضاحت کرنی چاہتے ہیں۔ تلمیحات سے بھی انہوں نے کام لیا ہے۔ ان کے پردے میں بھی اہم نکتوں کو سمونے کی کوشش کی ہے۔ زبان کے جادو کا بھی انہیں احساس ہے۔ وہ انداز (؟) کے تاثر سے بھی واقف ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ وہ ان سب سے کام لیتے ہیں اور ان سب سے مل کر ان کی نظموں کا شاعرانہ انداز وجود میں آتا ہے۔ اور وہ شعریت پیدا ہوتی ہے جو ان کی نظموں کی نمایاں خصوصیت ہے۔ اس شعریت کا سب سے نمایاں پہلو یہ ہے کہ وہ موضوع سے مناسبت کے نتیجے میں پیدا ہوتی ہے۔ حالی کی شخصیت کا عکس اس میں صاف نظر آتا ہے۔ اور اس میں اس کی بڑائی ہے۔

(۱۲)

اردو شاعری میں منظومات حالی کو ایک خاص مرتبہ حاصل ہے۔ وہ اردو شاعری

میں ایک تحریک اور ایک رجحان کی حیثیت رکھتی ہیں ۔ انھوں نے اردو شاعری کے لیے نئی راہیں تعمیر کی ہیں اور اس کو نئی منزلوں سے ہمکنار کیا ہے ۔ وہ ایک دور کی ترجمان ہیں ایک بدلتے ہوے ماحول کی عکاس ہیں ۔ ایک قوم کے دل کی دھڑکن ان میں صاف سنائی دیتی ہے ۔ انھوں نے ایک قوم کو زندگی بخشی ہے اور قوم نے انھیں زندہ کردیا ہے ۔ جب تک وہ قوم زندہ ہے یہ نظمیں بھی زندہ ہیں ۔

یہ نظمیں اس دور میں ایک تحریک تھیں لیکن انھوں نے ایک ایسی روایت کی طرح ڈالی جس نے اردو شاعری کی روایات میں ایک نمایاں حیثیت حاصل کر لی ۔ ان نظموں سے اردو شاعری میں جدت کی ایک تحریک شروع ہوتی ہے ۔ اور یہ جدت اردو شاعری میں اس طرح گھر کرلیتی ہے کہ اس کا جزو بن جاتی ہے ۔ حالی کی یہ جدت اردو شاعری میں ایک کامیاب تجربہ ہے ۔ اس تجربے نے اردو نظم میں نئی فضائیں پیدا کی ہیں ۔ یہ جدت حالی کے ذہن کا اختراع نہیں تھی بلکہ بدلتے ہوئے حالات کا تقاضا تھی ۔ زندگی کا قافلہ اس وقت جس موڑ پر آگیا تھا اس کا تقاضا یہ تھا کہ اردو شاعری میں جدید طرز کی نظموں کی ابتدا کی جائے ۔ کیونکہ نئے مسائل قدیم اصناف میں نہیں آسکتے تھے ۔ ان مسائل میں وسعت تھی ۔ پیچیدگی بھی ۔ اس لیے ان کو بیان کرنے کے لیے بھی کچھ وسعت کی ضرورت تھی ۔ حالی ان مسائل کا گہرا شعور رکھتے تھے ۔ اس لیے ان مسائل کو انھوں نے اپنا موضوع بنایا اور ان کے فنکارانہ شعور نے اپنے اظہار کے لیے نئے سانچے استعمال کیے ۔ مسدس ، مخمس ، مربع ، مثنوی ، ترکیب بند ، ان تمام اصناف کو اپنے خیالات کے اظہار کے لیے استعمال کیا ہے اس سے قبل اردو شاعری میں ان اصناف کا استعمال ملتا ضرور ہے ۔ نظیر اکبر آبادی اس میں پیش پیش رہے ہیں لیکن حالی کے ان اصناف کو جو عرصہ ہوا بھلائی جاچکی تھیں ، ازسرنو ایک زندگی بخشی اور اس طرح ان کو استعمال کیا کہ وہ سب ان کی اپنی ہوگئیں ۔ حالی نے انھیں اپنایا اور انھوں نے حالی کو اپنالیا ۔

حالی کی نظموں میں نئے سانچوں کے استعمال کو خاصی اہمیت حاصل ہے لیکن ان کی بڑائی کا راز درحقیقت اس افادی پہلو کو پیش کرنے میں ہے جس کے گہرے شعور نے حالی سے ان نظموں کی تخلیق کرائی ہے ۔ یہ افادی زاویۂ نظر اردو شاعری میں بالکل نیا ہے ۔ قومی

زندگی کے مسائل پر اس سے قبل اس زاویۂ نظر سے غور نہیں کیا گیا ۔ حالی اس افادی رجحان کو اردو نظم میں لائے اور قومی زندگی کے بنیادی مسائل کی ترجمانی اجتماعی زاویۂ نظر سے کی ۔ حالی سے قبل یہ خبر اس کا ذکر بھی کیا ہے، حالی کے زمانے میں بھی کوئی دوسرا اس طرف توجہ نہ کر سکا ۔ حالی اس اعتبار سے منفرد رہے ۔ انہوں نے قومی اور اجتماعی مسائل پر نظمیں لکھنے کی ایک فضا پیدا کی ۔ اور اس فضا نے حالی کے بعد بہت سے نظم گو شاعر پیدا کئے ۔ اقبال اور جوش کو بھی اسی فضا نے پیدا کیا ہے جو حالی کے ہاتھوں وجود میں آئی تھی۔ حالی نہ ہوتے تو اقبال نہ ہوتے اور اگر اقبال نہ ہوتے تو جوش اور دوسرے جدید شاعروں کا وجود نہ ہوتا ۔

منظومات حالی اسی وجہ سے ایک رجحان اور ایک تحریک کی حیثیت رکھتی ہیں ۔ انہوں نے اردو نظم کو نئی راہوں پر ڈالا ہے ۔ اس میں نئی امنگوں اور نئے ولولوں کے چراغ روشن کیے ہیں ۔ اس کی رگوں میں نئے خون کی گرمی پیدا کی ہے ۔ نئی جولان گاہوں سے روشناس کیا ہے اور نئے افق پر پرواز سکھائی ہے۔

***

حالی نقاد کی حیثیت سے

از

(جناب شوکت سبزواری)

کہتے ہیں شعر گوئی اور چیز ہے اور شعر فہمی اور چیز۔ ان دونوں کا اجتماع ایک شخص میں نہیں ہوتا۔ بہت سے شعر کہنے والے ہیں، جو اچھے برے شعر کی تمیز نہیں رکھتے اور بہت سے شعر کے پارکھ ایک شعر بھی موزوں نہیں کرسکتے۔ کسی حد تک یہ ٹھیک ہے۔ شعر کے پرکھنے کے لیے جن صلاحیتوں کی ضرورت ہے عام حالات میں وہ ایک شاعر میں نہیں ہوتیں۔ لیکن یہ بھی اکثر دیکھا گیا ہے کہ شعر کہنے والوں کی ایک خاصی اچھی تعداد ہے جو شعر کے حسن و رعنائی و زور و توانائی کا مذاق رکھتی ہے اور انہوں نے شعر کے اچھے معیار قائم کرکے اپنے اس ستھرے تنقیدی شعور کا ثبوت بھی پیش کیا ہے۔ مولانا حالی انہی میں سے ہیں۔ (وہ اردو ادب میں ایک جامع، مکمل اور رنگا رنگ شخصیت کے مالک ہیں۔ وہ نئے بھی ہیں اور پرانے بھی۔ ان کا ناتا ماضی سے بھی اتنا ہی مستحکم ہے جتنا حال سے۔ ان کی شاعری ان کے گہرے اور کسی قدر پختہ اصلاحی شعور کی پیداوار ہے، اس میں فن کی چمک، دمک ہے، سادگی و پرکاری ہے، جذبے کا جوش ہے، روایت کی پرستاری ہے اور اس کے خلاف بغاوت بھی)۔ میں حالی کو اردو کے عام شاعروں سے ذرا مختلف سمجھتا ہوں۔ ان کے شعر میں شعوری عنصر غالب ہے۔ یوں تو شعر جذبے اور احساس کی پیداوار ہے۔ اس میں پختگی اس وقت آتی ہے جب دل کی گرمی سے اس کو تپایا جاتا ہے، لیکن حالی کے یہاں جذبے کی حرارت کے ساتھ شعور کی تابناکی بھی ہے اور شاید یہی وجہ ہے کہ ان کی شخصیت میں شعر گوئی کے ساتھ شعر فہمی کچھ اس طرح گھل مل گئی ہے کہ وہ نقاد بھی اسی درجے کے ہیں جس درجے کے شاعر ہیں۔

کلیم الدین کا کہنا ہے کہ حالی اردو کے سب سے بڑے نقاد تھے۔ ان کی تنقید کی'' ابتدا

انھی کی ذات سے ہوئی۔ حالی کے متعلق یہ بہت جچی تلی اور متوازن رائے ہے۔ لیکن ساتھ ہی حالی کی نئی تنقید کو انھوں نے مغرب کے ادب و انشا کا اثر بتایا ہے۔ ان کے نزدیک حالی کے خیالات انگریزی ادیبوں سے ماخوذ ہیں۔ وہ انگریزی زبان سے واقف نہ تھے اس لیے ان کا قیاس ہے کہ انھوں نے یہ خیالات انگریزی کتابوں کے اردو ترجموں سے لیے یا اس زمانے کے انگریزی داں مصنفین اور انشا پردازوں سے۔ مجھے ان کی اس رائے سے اختلاف ہے۔ حالی اگر اردو کے بڑے نقاد تھے تو ان کے خیالات انگریزی ادب سے متضاد نہیں ہو سکتے۔ حالی شعر اور اس کی تنقید کا صحیح اور سچا فطری مذاق رکھتے تھے۔ ان کی بڑائی ان کی سچائی میں ہے۔ وہ جیسے فطری شاعر ہیں ان کی تنقید بھی ان کے فطری تقاضوں کی پیداوار ہے۔ میں انگریزی انشا پردازی اور اس کے تنقیدی ادب کو حالی کی فطری تنقیدی صلاحیتوں کے لیے ایک محرک، ایک قوت اور ایک اشارہ سمجھتا ہوں۔ انگریزی ادب کی فضا نے حالی کے خوابیدہ تنقیدی شعور کو بیدار کیا۔ لیکن یہ صحیح نہیں کہ حالی کے خیالات انگریزی نقادوں کی تحریروں کا چربہ ہیں۔ حالی کی آواز اس عہد کے مغربی نقادوں کی آواز نہیں۔ اس میں ان کی اپنی شخصیت کی جھلک ہے، ان کے دل کا درد ہے، سوز دروں کی کیفیت ہے۔

ہمارے اکثر نئے نقاد تنقیدی شعور و بصیرت سے محروم ہیں۔ ان کے یہاں ادب کے تاریخی تسلسل کی شاید کوئی حقیقت نہیں۔ انھوں نے مغرب کے تنقیدی سرمایہ کو دیکھا وہ ہماری زبان کی ہر ادبی شخصیت کی قدر و قیمت کا اندازہ مغرب کے تنقیدی معیاروں سے لگاتے ہیں۔ وہ حالی کے مداح بھی ہیں اور ان کے نکتہ چیں بھی۔ مداح اس لیے کہ ان کی تنقیدوں میں انھیں جدید مغربی تنقیدوں کی جھلک نظر آتی ہے۔ حالی کے سانچے مغربی نقادوں کے سانچوں سے مشابہ ہیں۔ ان کے نقطۂ نظر میں ویسی ہی وسعت اور ہمہ گیری ہے۔ ان کے یہاں ادب کی انھی قدروں پر زور دیا گیا ہے جو زندگی سے لی گئی ہیں اور جن میں اجتماعی شعور جلوہ فرما ہے۔ نکتہ چینی کی وجہ غالباً یہ ہے کہ حالی ”پیروی مغرب“ کے باوجود مغربی نہیں۔ ان کے تنقیدی اصول ان کی طبیعت کی اپج ہیں، ان کے گہرے وسیع تجربے اور مشاہدے کا نچوڑ ہیں۔ حالی کا قصور ان کے نزدیک یہ ہے کہ وہ نقال نہیں نقاد ہیں۔ انھوں نے مغرب سے خوشہ چینی کی جگہ اپنی نظر و بصیرت سے کام لیا ہے۔ اور ”طواف شمع“ سے آزاد ہو کر اپنی ”فطرت کے تجلی زار“ کو آباد کیا ہے۔

حالی کے تنقیدی کارناموں کے سمجھنے کے لیے اس زمانے کے سیاسی اور سماجی ماحول پر نظر رکھنی چاہیے۔ اردو شاعری کا آغاز صحیح معنی میں اورنگ زیب کے بعد ہوا۔ یہ ہندستان میں مسلمانوں کے سیاسی اور تہذیبی انحطاط کا زمانہ تھا۔ ادھر ان کا اقتدار رخصت ہوا اور گھٹا ادھر شاعری کی زبان کھلی۔ اس ماحول کے اثر سے اردو شاعری میں ایک نشے کی سی کیفیت آگئی۔ وہ دو صنفوں میں محدود تھی۔ ایک غزل دوسرے قصیدہ۔ غزل سے غالب کی "مے" کی طرح یک گونہ بیخودی طاری کی جاتی تھی اور غم دوراں کو بھلا کر غم جاناں سے دل بہلایا جاتا تھا۔ اور قصیدہ بھٹئی کے لیے وقف تھا۔ اس میں شاہ شطرنج کی طرح بے بس بادشاہوں کی تعریف میں زمین و آسمان کے قلابے ملائے جاتے تھے۔ ہماری شاعری ایک طرف سچائی اور خلوص سے خالی تھی۔ دوسرے اس میں "بوالہوسی اور کھوکھلا پن" کے لیے بہت اڑچنی ہوئی تھی۔ جوں جوں زمانہ گزرتا گیا اس کی یہ پستی بھی بڑھتی گئی اور ۱۸۵۷ء کے بعد یہ بالکل رسمی اور بے جان ہو کر رہ گئی۔ حالی نے اس شاعری کو ترکہ میں پایا اور یہ اس کے تنقیدی شعور کا اثر تھا کہ اس نے اپنی شاعری کے ان مصائب کو جھکایا اور اس کی تہذیب و اصلاح کا بیڑا اٹھایا۔ آل احمد سرور نے کہیں لکھا ہے کہ حالی نے "مقدمہ" سے پہلے شاعری کی اور شاعری کے بعد "مقدمہ" لکھا۔ حالی کا مقدمۂ شعر و شاعری ان کے تنقیدی اصولوں کی بہترین شرح ہے اور ان کی شاعری ان کی بہترین مثال ہے۔ انہوں نے عام نقادوں کی طرح ادبی اصطلاحوں کو سمجھایا ہے۔ شعر کی حقیقت سے نقاب اٹھا کر اس کے حسن و قبح کو دکھایا ہے۔ اردو کی اصناف شاعری کی قدر و قیمت کا اندازہ لگایا ہے۔ ان کی اصلاح کے لیے اچھے اور مفید مشورے دیے ہیں۔ اور اس کے بعد اپنے اصولوں اور اصلاحی مشوروں کی توضیح وتائید میں خود اپنا کلام پیش کیا ہے۔

شعر کے بارے میں حالی کی رائے ہے کہ وہ بڑی چیز ہے۔ اس میں عظمت و برتری ہے لیکن اس کی ایک شرط ہے۔ وہ یہ کہ شعر صالح ہو۔ اس میں قوموں کو قعر مذلت سے اٹھانے اور خواب غفلت سے جگانے کی صلاحیت ہو۔ شعر کا سوسائٹی سے گہرا تعلق ہے۔ یہ سوسائٹی سے جہاں اثر لیتا ہے وہاں اس پر اثرانداز بھی ہوتا ہے۔ شاعری جب بگڑتی ہے تو اس کی زہریلی ہوا سوسائٹی کو سخت نقصان پہنچاتی ہے۔ زبان اور روزمرے تک یہ بگاڑ پہنچ جاتا ہے۔ اس سے قوموں کے اخلاق میں فساد آتا ہے۔ شخصی کردار میں ضعف اور زبونی رونما ہوتی ہے۔ حالی کے نزدیک شعر کی

روح اور اس کا اصلی جوہر راستی ہے ، سادگی ہے ، خلوص ہے اور صنعت گری سے بیزاری - حالی نے ذیل کے قطعے میں غالباً گولڈ اسمتھ سے متاثر ہوکر شعر کو خطاب کیا ہے اور شاعری کے انھی محاسن کا ذکر کیا ہے :

اے شعر دل فریب نہ ہو تو تو غم نہیں پر تجھ پہ حیف ہے جو نہ ہو دل گداز تو
صنعت پہ ہو فریفتہ عالم اگر تمام ہاں سادگی سے آئیو اپنی نہ باز تو
جوہر ہے راستی کا اگر تیری ذات میں تحسین روزگار سے ہے بے نیاز تو
تو نے کیا ہے بحر حقیقت کو موج خیز ! دھوکے کا غرق کر کے رہے گا جہاز تو
وہ دن گئے کہ جھوٹ تھا ایمان شاعری قبلہ ہو اب ادھر تو نہ کیجو نماز تو
چپ چاپ اپنے سچ سے کیے جا دلوں میں گھر اونچا ابھی نہ کر علم امتیاز تو
اے شعر راہ راست پہ تو جب کہ پڑ گیا اب راہ کے نہ دیکھ نشیب و فراز تو
ہوتی ہے سچ کی قدر پہ بے قدریوں کے بعد اس کے خلاف ہو تو سمجھ اس کو شاذ تو

اس تمہیدی بحث کے بعد آئیے دیکھیں حالی نے شعر کی اچھائی اور برائی کا کیا معیار بتایا ہے اور اس کو پرکھنے اور ٹھیک ٹھیک جانچنے کے ان کے نزدیک کیا اصول ہیں - حالی سچائی کو شعر کی جان سمجھتے ہیں اور سادگی کو اس کا پیکر ، سادگی اور جذبے کی سچائی کے اجتماع سے شعر میں زندگی ، تازگی ، روشنی اور توانائی ہوتی ہے - حالی شعر کی زندگی و توانائی کو جوش کہتے ہیں - شعر کی پوری کائنات حالی کے خیال میں اس کی یہ تین صفات ہیں - سادگی ، اصلیت اور جوش - اس کی کسی قدر تفصیل آئندہ آئےگی - یہ میں عرض کرچکا ہوں کہ حالی کو جو اردو شاعری ترکے میں ملی اس میں راستی کا جوہر نہ تھا - حالی کے لفظوں میں جھوٹ اور مبالغہ عام شعراء کا شعار ہوگیا تھا - عجیب و غریب باتیں ، انوکھے قصے ، روایتی عشق کے چونچلے دلوں میں گھر کر گئے تھے - زبان اپنی وسعت کھوچکی تھی - اس میں نمو ، نہ رہا تھا - بہت سے الفاظ و محاورات غریب و وحشی خیال کیے جاتے تھے - جو محاورات جس پہلو پر ایک بار برت لیے گئے تھے وہ دوسرے پہلو سے نہیں برتے جاسکتے تھے - تشبیہات و استعارات کا حال بھی یہی تھا - ان پر اردو کی یہ مثل صادق آتی تھی -

”بندھ گیا سو موتی رہ گیا سو پتھر،،

اصناف محدود ، مضامین گنے چنے ، زبان بندھی ٹکی ، تراکیب و اسالیب تر سے ترشائے ، ایک ہی لکیر تھی جسے پیٹے جارہے تھے ۔

حالی نے اردو شاعری کو اس پستی سے اٹھانے کے لیے دو طریقے اختیار کیے ۔ اول انھوں نے خود نئی شاعری شروع کی اور شعر کے اچھے اور معیاری نمونے ہمارے سامنے پیش کیے ۔ اس کے بعد شعر پر ایک جامع تحقیقی اور تنقیدی بحث کی ، جس میں انھوں نے شعر کے چہرے سے نقاب اٹھایا جو مسلمانوں کے سیاسی اور تہذیبی زوال کے زمانے میں اس پر ڈال دیا گیا تھا اور شاعری کی اصلی شرطیں بتائیں ۔ شعر کی اصلاح اور اس کو ٹھیک ٹھیک سمجھنے کے لیے یہ بنیادی بحثیں ضروری تھیں ۔ اس سلسلے میں شعر گوئی کے لیے جو شرطیں انحطاط اور پستی کے زمانے میں ضروری سمجھ لی گئی تھیں اور بعض صفات جو شعر کے لوازم اور اس کے اصلی جوہر قرار دے لی گئی تھیں حالی نے ان کی تردید کی ۔ مثلاً شاعری کی اولین شرط یہ سمجھی جاتی تھی کہ شاعر موزوں طبع ہو یعنی الفاظ کو نظم کا جامہ پہناسکے ۔ حالی نے بڑے شد و مد کے ساتھ اس غلط خیال کا رد کیا ۔ انھوں نے بتایا کہ وزن شعر کے لیے ضروری نہیں ۔ اس کو شعر سے وہی نسبت ہے جو بول کو راگ سے ہے ۔ قافیہ بھی شعر کی حقیقت سے خارج ہے ۔ زیادہ سے زیادہ وزن اور قافیہ کو شعر کے محاسن میں شمار کیا جاسکتا ہے ۔ ان سے شعر کا نشا تیز ہوتا ہے اور اس کا منتر زیادہ کار گر ہوجاتا ہے ۔ شعر جذبے کو موثر انداز میں بیان کرنے کا نام ہے چاہے وہ نظم میں ہو یا نثر میں ۔ حالی کے نزدیک شعر کی اصلی اور ضروری شرطیں جن کے بغیر شعر کہنا ناممکن ہے یہ ہیں ۔ تخیل ۔ مطالعۂ حیات و کائنات اور تفحص الفاظ ۔

تخیل شاعر کے لیے بہت ضروری ہے ۔ اس کا بازو ہے جس پر اڑ کر وہ حیات و کائنات کی سیر کرتا ہے ۔ ایک طاقت ہے جو شاعر کو وقت اور زمانے کی قید سے آزادی دلاتی اور ماضی و استقبال کو حال میں کھینچ لاتی ہے ۔ شعر کے ادنیٰ و اعلیٰ ہونے کا دار و مدار اسی قوت پر ہے ۔ شاعر اسے ماں کے پیٹ سے ساتھ لے کر پیدا ہوتا ہے ۔ یہ فطرت کی ودیعت ہے ۔ اکتساب اور محنت کو اس میں دخل نہیں ۔ حالی کے نزدیک اس قوت کو اعتدال پر رکھنا بہت ضروری ہے ۔ اس کی بے راہروی سے شاعر بھٹک کر زمین و آسمان کے قلابے ملانے لگتا ہے اور خیالی طوطا مینا بناتا ہے ۔ اس پر قابو رکھنے کی دو صورتیں ہیں ۔ ایک یہ کہ اس کو

قوت ممیزہ یعنی پاسبان عقل کے تابع فرمان رکھا جائے ۔ دوسرے شعور کی لگام دے کر کائنات کے مظاہر و مناظر کی اس کو سیر کرائی جائے ۔ تخیل کی اصلی اور صالح غذا یہی ہے ۔ اس سے اس کو محروم نہ رکھنا چاہئے ۔ عالم دو ہیں ۔ ایک خارجی جسے آفاق کہتے ہیں ۔ دوسرے باطنی جسے انفس کہا گیا ہے ۔ قدرت کے کھیل ان دونوں عالموں میں دیکھے جاسکتے ہیں بشرطیکہ قدرت کو ہم کھیل نہ سمجھیں ۔

جانتا قدرت کو ہے ایک کھیل تو
کھیل قدرت کا تجھے دکھلائیں کیا

تفحص الفاظ کے معنی ہیں مناسب ، صحیح اور برمحل لفظوں کی جستجو اور ان کا انتخاب ۔ شعر یوں تو جذبے کا نام ہے ، لیکن اس کا اظہار لفظوں میں ہوتا ہے ۔ شعر میں اثر ، جادو اور اثری کیفیت اس وقت آتی ہے جب جذبے کو اس کے مناسب لفظوں میں ڈھالا جائے اور اسلوب و خیال میں یک رنگی و ہم آہنگی ہو ۔ ابن خلدون اور ابن قدامہ وغیرہ عربی زبان کے نقادوں کا خیال ہے کہ الفاظ معانی سے زیادہ ضروری ہیں اور شعر میں طرز ادا کی خیال سے زیادہ اہمیت ہے ۔ یہ تفریق صحیح نہیں ۔ طرز ادا اور خیال دونوں شعر کے لیے برابر ہیں ۔ ایک کو دوسرے سے جدا کرنا ادیب کا کام نہیں ۔ منطقی تجرید ہے ۔ اگر پھول کے رنگ کو خوشبو سے جدا نہیں کیا جاسکتا اور شعلے سے اس کی لپٹ اور حرارت الگ نہیں ہوسکتی تو لفظ و معنی کی جدائی بھی ممکن نہیں ۔

ارتباط لفظ و معنی ارتباط جان و تن

حالی کا یہ فیصلہ آج کل کے تنقیدی اصول کے مطابق ہے کہ شاعری کا کمال جس طرح الفاظ میں ہے معانی میں بھی ہے ۔

حالی شعر میں جدت ، اختراع اور ذاتی اپج کے قائل ہیں ۔ پامال راہوں پر چلنا انہیں پسند نہیں ۔ شعر تخلیقی ادب کی ایک قسم ہے ۔ ان کے خیال میں ابن رشیق کا یہ مشورہ اردو شاعری کی حد تک صحیح نہیں کہ شاعر اپنے پیش رو اساتذہ کا کلام ازبر کرے اور پھر اسی طرز پر شعر نکالے ۔ حالی کہتے ہیں کہ اگر اردو زبان کے شعراء نے جو پہلے ہی سے رسم پرست ہیں اور روایت پر ریجھے ہوئے ہیں اس مشورے پر عمل کیا تو اس کا نتیجہ یہ

ہوگا کہ اردو شاعری کی ایک نئی تن چلے گی اور '' حسن کہوارے میں سے آنکھیں کھولی ہیں اسی میں پڑی جھولنی رہے گی '' ۔

شعر کے اصلی عناصر کا ذکر اوپر ہوچکا ہے ۔ سادگی سے حالی کی مراد خیال اور طرز ادا دونوں کی سادگی ہے ۔ طرز ادا کی سادگی تو ظاہر ہے ۔ خیال کی سادگی یہ ہے کہ اس میں تاریکی و باریکی نہ ہو ، بلکہ تجربے کی سی وضاحت و روشنی ہو اور محسوس کی ہوئی چیز کی سی راستی اور چمک ۔ ان کے نزدیک اس کا معیار ہے ۔

'' خیال کیسا ہی بلند اور دقیق ہو مگر پیچیدہ اور ناہموار نہ ہو ۔ الفاظ جہاں تک ممکن ہو محاور اور روزمرہ کی بول چال کے قریب قریب ہوں ۔ جس قدر شعر کی ترکیب معمولی بول چال سے بعید ہوگی اور اسی قدر سادگی کے زیور سے معطل سمجھی جائے گی '' ۔

حالی نے سادگی اور عامیانہ پن میں فرق کیا ۔ سادگی اشکال اور ابتذال کے درمیان کی چیز ہے ۔ جب کلام ایک مقررہ سطح سے نیچے گر جاتا ہے اور اس کی سہل علامت یہ ہے کہ جاہل بازاری تو اسے سن کر اچھل پڑتا ہے اور جھومنے لگتا ہے مگر ایک حکیم دانا ناک بھوں چڑھاتا اور گھنیاتا ہے تو وہ سخیف ، مبتذل ، سبک اور رکیک سمجھا جاتا ہے ۔ سادگی اس کے اوپر کا درجہ ہے ۔ وہ ایسا صاف اور واضح کلام ہے جسے اعلیٰ سے لے کر ادنیٰ تک ہر طبقے اور ہر درجے کے لوگ برابر سمجھتے ہیں اور اس سے یکساں لذت اور حظ اٹھاتے ہیں ۔

اصلیت یا راستی کا مفہوم عام طور سے حقیقت یا '' نفس الامری واقعیت '' سمجھا جاتا ہے ۔ حالی کے نزدیک یہ صحیح نہیں ۔ اصلیت ان کے نزدیک جذبے کی حدت اور احساس کی شدت ہے ۔ جو مضمون کسی جذبے میں ڈوب کر ، کسی واقعہ سے متاثر ہو کر یا شدت کے ساتھ محسوس کرنے کے بعد باندھا جاتا ہے وہ اصلیت سے تجاوز کرنے کے بعد بھی اصلیت پر مبنی ہوتا ہے ۔ یہ نکتہ بہت اہم ہے ۔ اس کے سمجھنے سے ادب کے بہت سے پیچیدہ مسئلے حل ہوجاتے ہیں ۔ عقدے کھل جاتے ہیں ۔ آپ کو شاید تعجب ہو مولانا حالی کے نزدیک ذیل کے دو شعر جن میں سے ایک نظیری کا ہے اور دوسرا عرفی کا ، اصلیت پر مبنی ہیں ۔

تو نظیری ز فلک آمدہ بودی چو مسیح باز پس رفتی و کس قدر تو نشناخت دریغ

سر برزدہ ام بامہ کنعاں ز یکے جیب معشوق تماشا طلب و آئینہ گہرم

" گو ایسی (فخر و خودستائی) کے مضامین مبالغے سے خالی نہیں ہوتے مگر ان میں کم و بیش راستی کی جھلک ضرور ہوتی ہے ۔ اور اگر فرض کرلیا جائے کہ ایسے مضامین میں راستی مطلق نہیں ہوتی تو بھی اس میں کچھ شک نہیں کہ بعض شعراء کے فخر و مباہات میں ایسا جوش ہوتا ہے جس سے صاف پایا جاتا ہے کہ وہ لوگ فی الواقع شعر لکھتے وقت ایسا ہی سمجھتے تھے اور صرف ان کا ایسا سمجھنا اس بات کے لیے کافی ہے کہ ان کے فخریہ اشعار کو اصلیت پر مبنی سمجھا جائے کیونکہ اصلیت کے معنی جو کچھ کہ ہم سمجھتے ہیں وہ یہ ہیں کہ شاعر کے بیان کا کوئی منشا یا محکی عنہ نفس الامر میں یا شاعر کے ذہن میں موجود ہو " ۔

حالی کے نزدیک اصلیت کے جانچنے کا معیار جوش ہے ۔ ادب کی اصلیت اور منطق کی اصلیت میں فرق ہے ۔ منطق کی اصلیت کا تعلق نفس الامر سے ہے اور ادب کی اصلیت کا ادیب کے ذہن سے ۔ میں نے جوش کو شعر کی زندگی کہا تھا ۔ شعر میں زندگی ، تازگی اور حرکت اصلیت آتی ہے ۔ جو بات جذبے میں ڈوب کر کہی جاتی ، جس میں احساس شامل نہیں ہوتا ، اس میں جوش اور تازگی بھی نہیں ہوتی ۔ اس قسم کے اشعار بے جان ہوتے ہیں ۔ وہ دل سے نہیں ابھرتے شاید اسی لیے دل میں نہیں اترتے ۔ بے جان اشعار لفظوں کا انبار ہیں اور اصلیت سے خالی ۔ حالی کے نزدیک جوش اور اصلیت کا ساتھ چولی اور دامن کا سا ہے ۔ جوش ہے تو اصلیت بھی ہے اور اصلیت (یعنی اثر و خلوص) ہے تو جوش بھی ۔ حالی کی یہ نکتہ آفرینی آج بھی جب کہ تنقید اتنی ترقی کر گئی ہے ویسی ہی صحیح ہے ۔ اردو کے مشہور " مغرب زدہ " نقاد کلیم الدین احمد نے اب سے چند سال پہلے مغربی نقادوں کے خیالات کا نچوڑ ان الفاظ میں پیش کیا تھا ۔

" اسلوب بیان نفس مضمون سے زیادہ اہم نہ ہو ۔ اگر الفاظ نے تجربات* سے زیادہ اہمیت حاصل کرلی تو پھر شاعری ممکن نہیں ۔ اگر جذبات میں شدت اور اصلیت ہے تو عموماً اسلوب بیان میں حیرت انگیز سادگی ظاہر ہوتی ہے جو بظاہر نثر سے مشابہ ہوتی ہے لیکن ایسی سادگی اور نثر میں مشرقین کا فرق ہے " ۔

* جذبات ؟

کلیم نے یہ "مشرمن کا فرق" واضح نہیں کیا ۔ حالی نے اس کو جوش سے تعبیر کیا ہے ۔ یہاں بھی حالی "مرعوب زدہ" نقادوں سے بازی لے گئے ہیں ۔ جوش کی تفسیر خود حالی نے جن الفاظ میں کی ہے ان سے اس فرق پر روشنی پڑتی ہے ۔ مولانا فرماتے ہیں :—

جوش سے یہ مراد ہے کہ مضمون ایسے بے ساختہ الفاظ اور موثر پیرایہ میں بیان کیا جائے جس سے معلوم ہو کہ شاعر نے اپنے ارادے سے یہ مضمون نہیں باندھا بلکہ خود مضمون نے شاعر کو مجبور کرکے اپنے تئیں اس سے بندھوایا ہے"۔

اس کے بعد فرماتے ہیں : -

" جوش سے یہ مراد نہیں ہے کہ مضمون خواہ مخواہ نہایت زوردار اور جوشیلے لفظوں میں ادا کیا جائے ۔ ممکن ہے الفاظ نرم ، ملائم اور دھیمے ہوں مگر ان میں غایت درجے کا جوش چھپا ہوا ہو ۔ مہر کہتے ہیں :—

ہمارے آگے ترا جب کسی نے نام لیا دل ستم زدہ کو ہم نے تھام تھام لیا

مگر ایسے دھیمے الفاظ میں وہی لوگ جوش کو قائم رکھ سکتے ہیں جو میٹھی چھری سے خنجر کا کام لینا جانتے ہیں ۔"

یہاں ایک غلط فہمی کا ازالہ ضروری ہے جس میں حالی کے موافق و مخالف سبھی مبتلا ہیں ۔ خصوصیت کے ساتھ ان کے مخالفوں نے اس غلط فہمی کی وجہ سے حالی پر بہت لے دے کی ہے ۔ حالی نے شعر کے اصلی عناصر یعنی سادگی ، جوش اور اصلیت کی تفصیل و تشریح کے بعد لکھا تھا کہ ہمارے اردو شعرا کے دیوان ایسے اشعار سے بھرے پڑے ہیں جو شعر کے ان تین اصلی جوہروں سے خالی ہیں ۔ جو مضامین قدیم سے بندھتے چلے آئے ہیں اور بندھتے بندھتے بمنزلہ اصول مسلمہ کے ہوگئے ہیں انہی کو بادنیٰ تغیر ہمارے شعرا باندھتے رہے ہیں اور ان سے سرمو تجاوز نہیں کرتے ۔ مثلاً معشوق کو بے وفا ، بے مروت ، ظالم ، قاتل جلاد وغیرہ کہتے ہیں اور اپنے کو غمزدہ ، مصیبت کا مارا ، بدبخت اور آوارہ بتاتے ہیں ۔ باغ میں سے سرو ، قمری ، گل و بلبل کا انہوں نے انتخاب کرلیا ہے اور صحرا سے سراب ، صرصر ، رہزن اور

خضر کا - یہ اور اسی قسم کے چند الفاظ ہیں جن پر اردو زبان کی غزل گوئی کا دار و مدار ہے۔ اس کا مطلب یہ لیا گیا کہ حالی ان الفاظ، استعارات و کنایت کے سرے سے مخالف ہیں۔ وہ ان کو غزل سے نکالنا چاہتے ہیں۔ ان کے خیال میں غزل کا ہر وہ شعر رسمی اور روایتی ہے جس میں یہ الفاظ یا استعارے استعمال ہوں اور اس لیے بے جان ہے۔ چنانچہ ایک طرف اس کا یہ اثر ہوا کہ حالی کے خلاف غزل کہنے والوں میں ایک طوفان اٹھ کھڑا ہوا۔ ان خوش فہموں نے یہ سمجھا کہ حالی غزل کے دشمن ہیں۔ وہ اس کی گردن مارنا چاہتے ہیں۔ یہ لوگ کیل کانٹے سے لیس ہو کر غزل کی حمایت میں نکل کھڑے ہوئے اور حالی کے خلاف ہنگامہ آرائی کر کے آسمان سرپر اٹھا لیا۔ دوسری طرف حالی کی تنقید کا سہارا لے کر یہ فتویٰ صادر کردیا گیا کہ اردو زبان کا ہر غزل گو شاعر جس کے یہاں یہ پامال اور فرسودہ الفاظ ہیں وہ پرانی ریت کا بت اور لکیر کا فقیر ہے۔ اس کو قبول عام کے دربار میں جگہ نہ دی جائے۔ حالی کا مطلب سمجھنے میں دونوں سے غلطی ہوئی۔ حالی ان الفاظ کے مخالف نہیں۔ وہ یہ نہیں کہتے کہ غزل سے ان تمام الفاظ کو نکال دیا جائے اور ان کی جگہ دوسرے الفاظ اور کنائے ایجاد کیے جائیں۔ اور یہ ممکن بھی نہیں۔ ظالم کو اگر ظالم نہ کہیں تو کیا کہیں۔ بے وفا اور بے مروت کے لیے کون سا انوکھا لفظ وضع کریں اور اپنی جدت طبع دکھائیں۔ رہزن کو خضر کیسے کہیں اور خضر کو رہزن کیوں بتائیں۔ گل و بلبل اور سرو و قمری کا ذکر کیوں نہ کریں۔ سراب و صرصر کو کیسے بھول جائیں؟ ان باتوں پر ان بزرگوں نے غور نہیں کیا۔ مولانا حالی نے صنف غزل پر بحث کرتے ہوئے اس کو صاف کردیا تھا اور میرا خیال ہے اس کے بعد ان کا مطلب سمجھنے میں کوئی غلطی نہیں ہونی چاہئے تھی۔ مولانا فرماتے ہیں۔—

> "اگر علم کی ترقی سے بہت سے قدیم شاعرانہ خیالات محض غلط اور بے بنیاد ثابت ہوجائیں تو بھی جن الفاظ کے ذریعے سے وہ خیالات ظاہر کیے جاتے تھے وہ الفاظ ترک نہیں کیے جاتے" - جیسے سیمرغ اور دیوپری کا موجود ہونا - ظلمات میں چشمۂ حیواں کا مخفی ہونا۔ "شاعر کا کام یہ نہیں کہ ان خیالات سے بالکل دست بردار ہوجائے بلکہ اس کا کمال یہ ہے کہ حقائق و واقعات اور سچے اور نیچرل خیالات کو اپنی غلط اور بے اصل باتوں کے پیرایہ میں بیان کرے اور

اس طلسم کو جو قدماء باندھ گئے ہیں ہرگز ٹوٹنے نہ دے۔ ورنہ بہت جلد دیکھے گا کہ اس نے اپنے منتر سے وہی اژدہر بھلا دئے ہیں جو دلوں کو تسخیر کرتے تھے۔ ،،

اس کے بعد فرماتے ہیں —

،، جو لوگ اُردو شاعری کو ترقی دینا یا یوں کہو کہ اس کو صفحۂ روزگار پر قائم رکھنا چاہتے ہیں ان کا فرض ہے کہ اصناف سخن میں عموماً اور غزل میں خصوصاً اس اصول کو ملحوظ رکھیں کہ سلسلۂ سخن میں نئے اسلوب جہاں تک ممکن ہو کم اختیار کئے جائیں اور غیر مانوس الفاظ کم برتے جائیں۔ مگر نا معلوم طور پر ان کو بڑھاتے رہیں اور زیادہ تر کلام کی بنا قدیم اسلوبوں اور معمولی الفاظ و محاورات پر رکھیں ،، ۔

مولانا یہ چاہتے ہیں کہ جو الفاظ قدماء نے استعمال کئے ہیں ان کو بے سوچے سمجھے ان کی ریس میں استعمال نہ کیا جائے اور طوطے کی طرح ان کی رٹ نہ لگائی جائے۔ بلکہ صحیح اور سچے جذبات ان میں ادا کرکے دل کی گرمی اور احساس کی تازگی سے ان میں تازگی، حرکت اور توانائی کی لہر دوڑا دی جائے۔ الفاظ کیا ہیں خون کی نالیاں ہیں۔ پانی کی جدولیں ہیں۔ مردہ اور بے جان نالیوں میں خون کے دوڑنے سے جان آجاتی ہے۔ خشک اور اٹی ہوئی جدولیں پانی چھوٹتے ہی سیراب ہو جاتی ہیں۔ پرانے لفظوں کے شیشوں میں جذبات کی ،، صہبائے میناگداز ،، زندگی کس لیے نہیں دوڑا سکتی۔ مفہوم لفظ کی جان ہے۔ ایک ماہر فن کار کے ہاتھ میں لفظ موم کی طرح ہے۔ وہ اس کو طرح طرح سے ڈھالتا ہے اور ہر مرتبہ نئے انداز سے استعمال کرتا ہے۔ مولانا فرماتے ہیں۔ الفاظ کے حقیقی معنوں پر ہی قناعت نہ کی جائے بلکہ کبھی مجازی معنوں میں، کبھی استعارہ اور کنایہ کے طور پر اور کبھی تمثیل کے پیرایہ میں ان کو استعمال کیا جائے۔ یہ لفظوں کا حشر و نشر اور ان کی نشأۃ ثانیہ ہے۔ مردہ اور بے جان لفظوں میں اس طرح جان ڈالی جاتی ہے۔ زبان اور خیال میں یک رنگی اور ہم آہنگی قائم رکھی جاتی ہے۔ پرانے لفظوں میں نئی روح پھونکنے کی ایک یہی صورت ہے۔ مثلاً اقبال کے اس شعر میں ،،باغبان،، ،، گل،، اور ،، بہار،، وغیرہ الفاظ بڑے پرانے اور پامال ہیں، لیکن اقبال نے ان کو بطور اشارہ و علامت بالکل نئے مفہوم میں استعمال کیا ہے۔

باغبان چارہ فرما سے یہ کہتی ہے بہار   زخم گل کے واسطے تدبیر مرہم کب تلک

اگر لفظوں میں اس طرح کا تصرف نہ کیا جائے تو خیالات کی وسعت محدود اور معمولی زبان میں ہرگز نہ سمائے۔

اس سلسلے میں فطری شاعری کی بحث آجاتی ہے۔ فطری شاعری کا مفہوم یہ ہے کہ شعر کے الفاظ، اسالیب اور خیالات سب فطرت اور عادت کے مطابق ہوں۔ بے محل الفاظ استعمال نہ کیے جائیں، دوراز کار تشبیہات اور بعید ازقیاس استعارات نہ لائے جائیں۔ خیال نیچرل ہو، حد سے زیادہ مبالغہ نہ برتا جائے۔ کوئی ایسی بات نہ ہو جسے کوئی نہ مانے۔ اس ضمن میں حالی نے ہماری غزل اور قصیدے کے اسالیب پر بحث کرکے انہیں خلاف فطرت بتایا ہے اور شعراء کے کلام سے اس کی مثالیں پیش کی ہیں۔ ناسخ کا شعر ہے :—

کبھی ہے دھیان عارض کا کبھی یاد مژہ دل کو کبھی ہیں خار پہلو میں کبھی گلزار پہلو میں

اس کا مضمون فطرت اور عادت دونوں کے خلاف ہے۔ محبوب کے عارض کا دھیان جیسا فرحت افزا ہے یاد مژگاں بھی ویسے ہی مسرت بخش ہے۔ شاعر نے جو ان میں فرق کیا ہے وہ صحیح نہیں۔

امیر کا شعر ہے :—

کیا نزاکت ہے جو توڑا شاخ گل سے کوئی پھول آتش گل سے پڑے چھالے تمہارے ہاتھ میں

یہ مضمون بھی صحت سے دور ہے۔ پھول آگ نہیں جس کے چھونے سے ہاتھ میں چھالے پڑجائیں۔

اس افراتفری کا بڑا سبب تخیل کا غلط استعمال اور اس کا جادۂ اعتدال سے انحراف ہے۔ متقدمین شعراء نے جو الفاظ بطور استعارہ استعمال کیے تھے متاخرین نے ان کے اصلی معنی لے لیے اور غضب یہ کیا کہ جدت کے خیال سے ان پر اصل احکام جاری کردیے اور ان کے تمام لوازمات بھی ثابت کردیے۔ دراصل یہ لکھنوی شاعری کا عیب ہے۔ یوں تو متاخرین کے یہاں بھی عام طور سے غیر فطری شاعری کی مثالیں ملتی ہیں، لیکن لکھنؤ میں یہ رنگ بہت کھلا اور شاعری کا دار و مدار ہی مضمون آفرینی پر رہا اور اس کو شعرگوئی کا بڑا کمال سمجھا گیا۔

اردو شاعری پر مولانا حالی کے دو اعتراض ہیں۔ ایک یہ کہ وہ رسمی اور تقلیدی ہے۔ دوسرے یہ کہ محدود ہے۔ رسمی یا تقلیدی اس لیے کہ عام طور سے اردو شعراء کسی

جذبے سے متاثر ہوکر نہیں کہتے ۔ اساتذہ کے کلام کو سامنے رکھ کر اسی نہج پر شعر موزوں کرلیتے ہیں ۔ الفاظ وہی ، ترکیبیں وہی ، خیال وہی ۔ کہیں کہیں صرف اسلوب بدل دیا گیا ہے ۔ شاعری کیا ہے قافیہ پیمائی ہے ۔ اس میں ان کے خون جگر کی آمیزش نہیں ۔ محدود یوں ہے کہ ایک تو اردو شاعری غزل ، قصیدے ، مرثیے اور مثنوی میں محصور ہے ۔ دوسرے ان میں سے غزل اور مثنوی کو روایتی عشق و محبت کی داستان کے بیان کے لیے مخصوص کرلیا گیا ہے ۔ مولانا نے عام اردو شاعری کی اصلاح کے لیے ذیل کے مشورے دے ہیں ۔

(۱) شعر گوئی کے لیے فطری صلاحیت درکار ہے ۔ جس کی فطرت میں یہ ملکہ نہ ہو وہ شعر نہ کہے ۔

(۲) جھوٹ اور مبالغے سے احتراز کیا جائے ۔ شعر کا تعلق جذبات سے ہے ۔ سچے جذبات و تاثرات اس میں ہونے چاہییں ۔

(۳) زبان کو درستی ، صحت اور صفائی کے ساتھ اہل زبان کے روزمرہ کے مطابق استعمال کرنا چاہیے ۔

زبان کے بارے میں مولانا کی رائے ہے کہ اس کے دائرہ کو تنگ نہ کیا جائے ۔ یہ زبان کی ترقی اور اس کی اشاعت کی راہ میں بڑی رکاوٹ ہے ۔ کسی لفظ کی صحت اور درستی کا معیار عام بولنے والوں کا استعمال ہے ۔ جن الفاظ کو اس دربار سے چلن مل چکا ہے وہ ٹکسال باہر قرار نہیں دے جاسکتے ۔ وہ الفاظ صحیح ہیں اور اس لیے واجب الترک نہیں جو کسی دوسری زبان سے اردو میں آئے ہیں اور اصل زبان کی گرامر یا قیاس لغوی کے خلاف اردو میں برتے اور بولے جاتے ہیں جیسے موسم (بفتح سین) ہیت (بفتح یا) نشا (بروزن وفا)

اس کے بعد مولانا نے اردو کی اصناف شاعری میں سے غزل ، قصیدہ اور مثنوی کو لے کر ان پر تفصیل سے بحث کی ہے ۔ ان کے عیوب گنائے ہیں اور اصلاح کے لیے مفید مشورے دے ہیں ۔ یہ حصہ پوری بحث کی جان ہے ۔ غزل کا مزاج بتاتے ہوئے مولانا نے لکھا ہے کہ ہماری شاعری کی یہ صنف بڑی مفید اور جان دار ہے ۔ اس کا سب سے بڑا حسن آج کے نقادوں کی نگاہ میں اس کا سب سے بڑا عیب ہے ۔ یعنی غزل کے اشعار کا ایک دوسرے سے جدا ہونا اور ان میں باہمی ربط نہ پایا جانا ۔ غزل اپنے اس مزاج کی وجہ سے بسیط خیالات اور تازہ

یہ تازہ مفرد کیفیات و تاثرات کے اظہار و بیان کے لیے بہت زیادہ موزوں ہے۔ غزل کو ہمارے ادب میں بڑا درجہ حاصل ہے۔ اس لیے اس کی اصلاح کی طرف سب سے پہلے متوجہ ہونا چاہئیے ، لیکن یہ آسان کام نہیں۔ غزل کی اصلاح جس قدر ضروری ہے اسی قدر دشوار بھی ہے۔ یہ خود مولانا کے الفاظ ہیں سنیے :-

" غزل میں جو عام دلفریبی ہے اصلاح کے بعد اس کا قائم رہنا مشکل ہے۔ جو کان ٹپے ، ٹھمری سے مانوس ہوجاتے ہیں وہ دھرپت اور خیال سے لذت نہیں اٹھا سکتے۔ داستان سننے والوں کی پیاس تاریخی واقعات سے ہرگز نہیں بجھتی۔ بوالہوسی اور کامجوئی کی باتوں میں جو مزا ہے وہ خالص عشق و محبت میں ہر شخص کو حاصل نہیں ہوسکتا۔ اوباش و الواط کی بولیوں ٹھولیوں میں جو چٹخارا ہے وہ سنجیدہ باتوں میں کسی بے حس ہی کو محسوس ہوسکتا ہے۔ جن مذاقوں پر ہزل و مطائبہ کا رنگ چڑھ جاتا ہے ان پر حکمت و اخلاق کا منتر کارگر نہیں ہوتا۔ جو لوگ سرمہ ، کاجل ، کنگھی ، چوٹی پر فریفتہ ہیں وہ حسن ذاتی کی حقیقت تک کیوں کر پہنچ سکتے ہیں ، لیکن زمانہ بآواز بلند کہہ رہا ہے کہ یا عمارت کی ترمیم ہوگی یا خود عمارت نہ ہوگی "۔

غزل میں عشق و الفت کے مضامین باندھے جاتے ہیں۔ اس میں یہ چاشنی رہنی چاہیے اس شراب سے سرور نکال کر اس کو سرکہ بنانا مناسب نہیں لیکن رسمی عشق کے ڈھکوسلے سے تو یہ کہیں بہتر ہے کہ محبت کے مفہوم کو عام کردیا جائے۔ ماں باپ کی محبت ، بھائی بہن کی محبت ، ملک و وطن کی محبت یہ اور اسی قسم کی دوسری لطیف و نازک لگاوٹوں کے نشے کی آمیزش کرکے بادۂ غزل کے سرور کو سہ آتشہ اور چہار آتشہ بنائے اور پھر اس کی تیزی و تندی کا لطف اٹھائے۔ مولانا کی رائے ہے کہ غزل میں جب عشقیہ مضامین باندھے جائیں ان کے لیے ایسے جامع الفاظ اختیار کیے جائیں جو دوستی اور محبت کے تمام انواع و اقسام اورجسمانی و روحانی تعلقات پر حاوی ہوں۔

ہمارے متقدمین شعرا کے یہاں مے نوشی پر فخر ہوتا تھا اور زاہدوں اور دوغلوں کو لتاڑا جاتا تھا۔ اس وقت ان باتوں میں سچائی تھی۔ رندوں اور زاہدوں کی ٹولیاں بنی ہوئی

تھیں اور ان میں اکثر نوک جھونک رہتی تھی۔ آج یہ باتیں ثقہ اور متدین شعرا کو زیب نہیں دیتیں۔ اصول شاعری کے مطابق یہ مضامین غزل میں باندھنا صرف ان لوگوں کا حق ہے جو یا تو خود اس میدان کے مرد ہیں یا پھر ان کو بطور مجاز و استعارہ استعمال کرتے ہیں۔ مثلاً اقبال کی اس رباعی میں 'مے' سے مراد علم و عرفان اور جذبہ و ایقان ہے۔ اور ساقی سے خدا:

ترے شیشے میں مے باقی نہیں ہے بتا کیا تو مرا ساقی نہیں ہے
سمندر سے ملے پیاسے کو شبنم بخیلی ہے یہ رزاقی نہیں ہے

غزل کو زمین اور خیالات کے اعتبار سے جہاں تک ممکن ہو وسعت دی جائے۔ دل کے ہر جذبے کا بیان اس میں کیا جائے، ہر جوش اور ولولے کو اس میں جگہ دی جائے۔ ہر تاثیر اور قلبی احساس کو لفظوں میں ڈھالا جائے۔ اس سے غزل میں تازگی آئے گی، توانائی پیدا ہوگی، زندگی کے آثار رونما ہوں گے۔ مضمون کتنا ہی نیا اور اچھا ہو، بار بار باندھنے سے اس کا لطف جاتا رہتا ہے۔ طبیعت اکتا جاتی ہے۔ اور وہ اجیرن ہوجاتا ہے۔ ایک مضمون کو مختلف پیرایوں اور رنگا رنگ اسلوبوں میں کرنا کمال شاعری نہیں۔ شعر کی روح جذبہ ہے۔ جذبے کی تکرار اور اعادے سے اس میں تازگی نہیں رہتی۔ حالی کے الفاظ میں وہ غزل جس میں ایک مضمون نئے نئے اسلوبوں میں باندھا گیا ہے۔ انگریزی مٹھائی کا بکس ہے کہ مٹھائیوں کی شکلیں مختلف ہیں لیکن مزہ سب کا ایک ہے۔

اردو شاعری میں شعر کے ظاہر پر زیادہ زور دیا جاتا رہا ہے۔ صنائع و بدائع، استعارات و تشبیہات، محاورات و امثال اس میں شک نہیں شعر کا زیور ہیں۔ ان کی وجہ سے شعر کا حسن دوبالا ہوجاتا ہے۔ لیکن ہمارے یہاں ان محاسن ہی کو شعر کی جان سمجھ لیا گیا ہے۔ شعر میں جذبے کے سوا سب کچھ ہوتا ہے۔ خصوصیت کے ساتھ متاخرین غزل گو شعراء فن کو فکر پر، طرز ادا کے حسن کو خیال کی رعنائی پر، لطف بیان اور صفائی زبان کو مضمون پر، صنعت کو سادگی پر، پینترے کو بھرپور وار پر، ترجیح دیتے رہے ہیں۔ ان کے یہاں صنعت گری سب کچھ ہے اور وہ اسی پر مٹے ہوئے ہیں۔ سنگلاخ زمینوں میں شعر کہہ کر اپنی طبیعت کی جودت اور خیال کی جدت دکھاتے ہیں۔ مرثیہ ہر چند اسی عہد انحطاط کی پیداوار ہے لیکن

اصناف سخن میں اس کا بڑا درجہ ہے ۔ وہ خاص اُردو کی چیز ہے ۔ اُردو مرثیہ فارسی اور عربی مرثیوں سے بہت مختلف ہے ۔ اس میں بڑی قوت و دلربائی ہے ۔ حالی نے اُردو مرثیہ کو بہت سراہا ہے اور قصیدے کے مقابلے میں اسے ترقی یافتہ بتایا ہے ۔ فرماتے ہیں ۔ " قصائد کی حالت ناگفتہ بہ ہے ۔ البتہ ہمارے شعراء نے مرثیہ میں ایک خاص قسم کی نمایاں ترقی کی ہے ۔ "اخلاق نقطۂ نگاہ سے مرثیہ اُردو شاعری میں بے مثال ہے اور وہ اخلاقی نظم کہلانے کا مستحق ہے "۔

مثنوی اردو کی بیانیہ شاعری ہے ۔ اس میں ہر قسم کے مضامین بیان ہوسکتے ہیں ۔ اس لیے سب سے زیادہ مفید اور کارآمد صنف شاعری اُردو میں یہی ہے ، لیکن یہ ہماری زبان کی بدقسمتی ہے کہ چند چھوٹی چھوٹی عشقیہ مثنویوں کے سوا اخلاق ، تصوف اور تاریخ وغیرہ میں کوئی اچھی اور معیاری مثنوی حالی کے زمانے تک نہیں لکھی گئی ۔ مثنوی میں ان شرائط کے علاوہ جن کی غزل یا قصیدے میں پابندی لازمی ہے ذیل کی شرطیں قابل مراعات ہیں :—

(۱) مثنوی ایک مربوط اور مسلسل نظم ہے ۔ اس میں ربط کلام کا لحاظ رکھنا نہایت ضروری ہے ۔

(۲) مثنوی کے قصہ کی بنیاد ناممکن اور فوق عادت امور پر نہ رکھنی چاہئے ۔

(۳) مبالغہ اغراق یا غلو کی حدوں تک نہ پہنچنے پائے ۔

(۴) کلام مقتضائے حال کے مطابق ہو ۔ مقام و محل کا خاص خیال رکھا جائے ۔

(۵) جو حالت کسی خاص یا چیز کی بیان کی جائے وہ فطرت اور عادت کے خلاف نہ ہو ۔

(۶) قصہ میں بے ہنگم پن نہ ہو ۔ یعنی ایک بیان دوسرے کی تکذیب نہ کرتا ہو ۔ یہ قصہ نگار کا پھوہڑ پن ہے ۔

(۷) قصہ میں کوئی ایسی بات نہ آنے پائے جو تجربے اور مشاہدے کے خلاف ہو ۔

(۸) ضمنی اور غیر اہم باتوں کو رموز اور اشارات کے پیرایہ میں بیان کیا جائے ۔

ان کے علاوہ کچھ اور شرطیں بھی ہیں جن کی تفصیل کے لیے وقت چاہئے ۔

حالی نے غزل اور مثنوی کا فرق بتاتے ہوئے ایک بڑی نازک اور لطیف بات کہی ہے۔ فرماتے ہیں کہ غزل کی نوعیت مثنوی سے بالکل جدا ہے۔ اس میں ایک شعر بھی اچھا نکل آئے تو ساری غزل کی شان بڑھ جاتی ہے۔ وہی ایک عمدہ شعر لوگوں کو یاد رہ جاتا ہے اور غزل کو زندۂ جاوید بنا دیتا ہے۔ باقی اشعار سے کسی کو کوئی سروکار نہیں رہتا۔ مگر مثنوی میں محض چند اشعار کے عمدہ ہونے سے کام نہیں چلتا۔ زنجیر کی ایک کڑی بھی ناہموار اور بے محل ہوتی ہے تو ساری زنجیر آنکھوں میں کھٹکتی ہے۔ اس سے ملتی جلتی بات کلیم نے نظم کی بابت کہی ہے۔

> " نظم ایک پیچیدہ شے ہے۔ اس میں ہر شعر یا ہر سطر بجائے خود زیادہ اہم نہیں۔ یہ شعر مکمل نظم کی ترقی کا سبب ہے۔ اگر ہر شعر جگر کے اشعار کی طرح اپنی طرف توجہ جذب کرلے۔ اگر ہر شعر پڑھنے والے کو چونکا دے۔ یعنی جزئیات اگر اہمیت اختیار کرلیں تو پھر کامیاب نظم کا وجود ممکن نہیں مطلب یہ نہیں کہ ہر شعر سپاٹ ہو۔ لیکن ہر شعر اتنا حسین بھی نہ ہو کہ پڑھنے والے کی توجہ اپنی طرف جذب کرلے اور اسے نظم کی ترقی کی طرف سے بے پروا بنا دے۔"

حالی کے تنقیدی معیاروں اور اصولوں کا مختصر سا خاکہ ہے جس سے ان اصولوں کی وضاحت نہیں ہوتی لیکن ان کا ایک دھندلا سا تصور ضرور قاری کے ذہن میں آجاتا ہے۔ مغرب کے نقادوں کے دو دبستان ہیں۔ کلاسیکی اور رومانی۔ حالی کو ان دونوں میں سے کسی ایک میں بھی نہیں رکھا جاسکتا۔ وہ رومانی بھی ہیں اور کلاسیکی بھی اگرچہ رومانی زیادہ ہیں اور کلاسی کی کم۔ ان کی رہنما اصل میں ان کی طبیعت ہے۔ ان کے تنقیدی اصول، جیسا کہ اوپر بیان کیا گیا، ان کی طبیعت کی اپج ہیں۔ ان میں ایک طرح کی انفرادیت ہے۔ اس میں وہ کولرج کی یاد دلاتے ہیں۔ اس کے ساتھ ہی انہوں نے گرد و پیش کے سماجی حالات کا گہرا مطالعہ کیا ہے۔ حیات انسانی اور کائنات پر بھی ان کی نظر ہے۔ انہوں نے جس طرح شاعر کے لیے حیات و کائنات کا مطالعہ ضروری قرار دیا ہے نقاد کے لیے بھی چمن فطرت کی سیر ان کے نزدیک لازمی ہے۔ ان کے یہاں انفرادیت اور آفاقیت کے درمیان توازن قائم رکھا گیا ہے۔ یورپ کے رومانی شعراء سے وہ بہت ملتے ہیں۔ اگرچہ ان میں سے کسی کے مقلد نہیں۔ حالی کی عظمت کا راز میرے

نزدیک ان کی اجتہادی شان میں ہے ۔ وہ اردو کے تنہا نقاد ہیں جس نے مغرب سے اثر تو لیا لیکن مغرب کی اندھی تقلید نہیں کی ۔ وہ ہماری شاعری کے مجدد اور تنقید کے مجتہد ہیں ۔ ان میں اور رومانی شعراء میں صرف اتنی مشابہت ہے کہ ان شعراء کی طرح حالی نے پہلے شاعری کی نئی راہ نکالی اس کے بعد شعر و شاعری پر بحث کرکے اپنی نئی شاعری کے اصول بتائے ۔ رومانی شعراء میں سے ہر ایک کی جھلک حالی کی تنقید میں ہے ۔ ' بلیک ' کی طرح وہ اردو شاعری کو قدماء کی تقلید سے آزاد کرانا چاہتے ہیں قوت تخیل کو اپنا رہنما بناتے ہیں ۔ فن اور عروض کی پابندیوں کے کچھ زیادہ قائل نہیں ۔ شاعر کے جذبات و احساسات کی ان کے یہاں وہی اہمیت ہے جو ' ورڈ سورتھ ' اور ' شیلی ' کے یہاں ہے ۔ ان میں کولرج سے وہ بہت زیادہ قریب ہیں ۔ ' کولرج ' کی طرح جذبے کو انہوں نے شعر کی روح کہا ہے اور اس پر زور دیا ہے کہ فلسفہ ، اخلاق ، تصوف اور نفسیات کے مسائل بھی شعر کا موضوع بن سکتے ہیں بشرطیکہ جذبات میں ڈوبے ہوئے ہوں اور شاعر نے شدت کے ساتھ محسوس کرنے کے بعد ان کو ادا کیا ہو ۔ حالی نے شعر کے تین اصلی عناصر بتائے ہیں اور گوئٹے نے چار۔ جوش دونوں کے یہاں ہے ۔ یہ جوش رومانی نقادوں کے سرخیل لونجیس کے یہاں بھی ہے ۔ اس کے نزدیک شاعری کی سب سے بڑی خوبی جوش ہے جو لفظوں کے بے ساختہ پن اور اسلوب کی روانی سے ظاہر ہوتا ہے ۔

تفحص الفاظ کے عنوان سے زبان اور روزمرہ کے متعلق حالی نے جو فیصلہ کیا ہے وہ اٹلی کے مشہور شاعر ڈانٹے کے خیال کے مطابق ہے ۔ اس نے بہت کچھ بحث و تمحیص کے بعد لکھا تھا کہ شاعر کو وہ زبان برتنی چاہیے جو ہر طبقہ کے لوگوں کے لئے یکساں ہو اور جسے عوام و خواص ، عالم و عامی ، مہذب اور انگھڑ سب آسانی کے ساتھ سمجھ سکیں ، لیکن یہ زبان گنواروں اور بازارو نہ ہونی چاہیے ۔ حالی نے شعر اور فن شعر پر جو جامع تنقیدی بحث کی ہے وہ ان کو آج بھی بڑا نقاد ثابت کرنے کے لیے کافی ہے ۔ ان کی بحث کا طریقہ ، اس کا انداز ، ترتیب بڑی حد تک منطقی ہے ، لیکن اسلوب ادبی ہے ۔ اس میں قریب قریب اتنی ہی جامعیت ہے جتنی ، ہڈسن ، کی کتاب " مقدمہ مطالعۂ ادبیات " اور ڈرنکوٹر کے رسالے " ادب میں فیصلہ " میں ہے ۔ اس کے موضوعات بھی وہی ہیں ۔ فرق صرف زمان و مکان کا ہے سماج اور اس کے مزاج کا ہے اور کہیں کہیں طرز و منہاج کا بھی ۔ یہ کوئی انوکھی بات نہیں ۔

***

شکوۂ ہند

(از سید ہاشمی صاحب فریدآبادی)

مولانا حالی مرحوم کی قومی نظموں میں " شکوۂ ہند " کئی اعتبار سے امتیاز کی شان رکھتا ہے :-

۱ - اس میں مسلمانوں کی قوم یا کسی گروہ سے خطاب نہیں کیا ، بلکہ کشور ہندوستان کو اپنا مخاطب بنایا ہے -

۲ - یہ تصور کہ مسلمان ایک جداگانہ قوم ہیں ، مولانا کی ہر نظم خصوصاً مسدس حالی میں مضمر و کارفرما ہے لیکن اس قدر صریح اور واشگاف پیرائے میں کہیں بیان نہیں ہوا جیسا کہ شکوۂ ہند میں -

۳ - نظم کا تیسرا امتیاز یہ ہے کہ بعد کے واقعات اور پاکستان کی تاسیس ، بالخصوص وسیع پیمانے پر مسلمانوں کی ہندوستان سے نقل مکانی نے اسے دوربینی اور پیش گوئی کی ایک عجیب مثال بنادیا - پہلا ہی شعر سن کر خیال ہوتا ہے کہ انسانی فن و دماغ کی بجائے شاید کوئی الہامی قوت تھی جس نے شاعر کی زبان سے یہ الفاظ ادا کرائے ہیں :-

الوداع اے کشور ہندوستان جنت نشاں   رہ چکے تیرے بہت دن ہم بدیسی میہماں

بعض مطبوعہ نسخوں میں پہلا مصرعہ اس طرح لکھا ہے :

" رخصت اے ہندوستاں اے بوستان بے خزاں "

یہ نظم ، مسدس کے بعد (غالباً سنہ ۱۸۸۳ع میں) لکھی گئی ہے - شاعر کے سامنے وہ زمانہ ہے جب کے ہندوستان کے مسلمان خواہ عرب سے آئے ، خواہ ترکستان و خراسان سے یہاں

مستقل توطن اختیار کرچکے تھے ۔ ان میں کروڑوں خود ہندوستان کی پرانی قوموں کے افراد تھے جنہیں اسلام کی ہمہ گیری نے ایک ہی برادری کے رشتے میں پرودیا " اُمۃً واحدہ " بنادیا تھا ۔ اس وسیع ملت میں براعظم ایشیا ، افریقہ ، یورپ کے سب ہی اسلامی ممالک اور گروہ شامل تھے۔ ان سب کے بنیادی عقائد اور تہذیب و اخلاق کے اصول ایک تھے اور عجیب تر بات یہ ہے کہ سب کی ملی تاریخ بھی ایک ہی ہوجاتی تھی چنانچہ اسلام کے دائرے میں داخل ہوتے ہی ایک عیسائی، سلطان صلاح الدین کو ، ایک ہندی محمود غزنوی کو اسی طرح اپنا ملی سورما سمجھنے لگتا تھا جس طرح ترکوں میں مسلم ابن قتیبہ اور بربریوں میں عقبہ ابن نافع یا طارق و موسیٰ محبوب و محترم ہوگئے تھے ۔ بیسیوں صوفیا ، علما ، فقہا مسلمانوں کے مشترک بزرگ مانے گئے اور خدائے واحد کے اقرار کی طرح ، ساری ملت کے واحد پیشوا کی ہر قریے ہر محلے میں پانچ وقت پکار پکار کے شہادت دی جانے لگی ۔

اسلامی وحدت کے یہ اسباب و آثار کسی سے مخفی نہیں لیکن عام مسلمان اپنی غفلت و کاہلی سے اور مسلم اکابر تنگ چشمی اور خود غرضی سے ان کا پورا فائدہ نہ اٹھا سکے ۔ ابتدائی دور کے بعد ساری ملت چھوٹی چھوٹی بادشاہیوں میں تقسیم ہوگئی ۔ عہد حاضر میں عقیدۂ وطنیت کا سیلاب یورپ سے آیا اور مسلمانوں کے افکار میں ایک اور تلاطم ڈال گیا ۔ مدت دراز سے تشتت و افتراق اور ایسے نامساعد حالات کے باوجود ملی وحدت کا تصور باقی رہنا دین مبین کی برکت اور قرآن مجید کی کرامت ماننی چاہئیں ۔ مگر اس تصور کو اردو شاعری میں سب سے پہلے روشن و مبرهن کرنے کا فخر حالی مرحوم کو حاصل ہے ۔ پھر ان کی یہ تلقین و تبلیغ کچھ ایسے پرزور و پراثر انداز میں ہوئی تھی کہ مسلمانوں کے دل و دماغ پر سرائت کر گئی اور سیاسی افکار و تحریکات جنھوں نے رفتہ رفتہ مطالبۂ پاکستان اور تقسیم ہند کا رویہ اختیار کیا کوئی شک نہیں کہ ایک حد تک اسی بزرگ کی تعلیم کا رھین منت ہیں ۔

شاعر کے مذکورۂ بالا اساسی تصور کو خیال میں رکھ کر ہم شکوۂ ہند کا مطالعہ کریں گے۔ یہ ترکیب بند گیارہ گیارہ بیت کے ۱۲ بند پر مشتمل ہے ۔ یاد رکھنا چاہئے کہ اس میں ہندوؤں سے یا ہندوستان کے باشندوں سے نہیں ، بلکہ سر زمین ہندوستان سے خطاب کیا گیا ہے ۔ پہلے

ہی ہند میں اس کے پہاڑ، دریا، سرسبزی اور شادابی کی تعریف آتی ہے جنہیں دیکھ کر نووارد مسلمان دجلہ و فرات کے دریا اور مرو و شیراز کے باغوں کو بھول گئے تھے۔ چنانچہ لکھتے ہیں کہ:-

یاد تجھ جیحوں رہا ہم کو نہ دجلہ اور فرات   تیرے گنگا جل نے سب سے تو کیے کام و زبان
فصل گل میں دیکھ کر جوبن سہانا ترے   مرو اور شیراز کے بھولے چمن اور گلستان

ان اشعار سے ظاہر ہے کہ شاعر اپنے آپ کو اور اپنی قوم کو غیر ہندوستانی سمجھتا ہے۔ دوسرے بند میں اسی حقیقت کی صراحت کی گئی ہے:

تھی ہماری قوم و ملت رسم و عادت سب جدا   رشتہ و پیوند کوئی ہم میں اور تجھ میں نہ تھا
بول چال اپنی الگ تھی اور زباں تیری الگ   تجھ سے ہم تھے اجنبی اور ہم سے تو ناآشنا
ہم میں اے ہندوستاں گو ہو بے جنسیت نہ تھی   تو نے لیکن اپنی آنکھوں پر لیا ہم کو بٹھا

پھر اپنی جداگانہ قوم کے اوصاف و خصائص میں کئی بند آتے ہیں جو قوت بیان کا نمونہ اور ایسے تاثیر میں ڈوبے ہوئے ہیں کہ نیم مردہ مسلمانوں میں بھی زندگی کا خون دوڑنے لگتا ہے۔ ملاحظہ فرمائیے:

ترکمانی صولت اور مغلی جلالت ہم میں تھی   عزم کُردی ہم میں تھا بدوی حمیت ہم میں تھی
ہاشمی آداب و عباسی فضائل ہم میں تھے   نطق اعرابی و عدنانی فصاحت ہم میں تھی
ضرب کراری و حرب خالدی رکھتے تھے ہم   سطوت حمزی و فاروقی جلالت ہم میں تھی

اپنی ابتدائی سادگی اور محنت مشقت کی زندگی پر فخر کرتے ہیں:-

ننگ تھا ہم کو مشقت سے، نہ مزدوری سے عار   جو بزرگی تھی، مشقت کی بدولت ہم میں تھی
ہم شترپانی سے پہنچے تھے جہاں بانی تلک   اس لیے باقی شتربانوں کی خصلت ہم میں تھی!
چھین لی سب ہم سے یاں شان عرب آن عجم   تو نے اے غارت گر اقوام و اکّال الامم

ہندوستان کے لیے "اکال الامم" کی ایسی بلیغ ترکیب مولانا مرحوم نے وضع کی تھی کہ ہمارے ادب میں ضرب المثل کی طرح رائج ہوگئی۔

آگے چل کر پھر مسلمانوں کے اسلامی فضائل، خصوصاً مہمان نوازی، سچی مساوات و مواخات کا ذکر آتا ہے۔ فرماتے ہیں:-

کھا کے نعمت دل ہمارا شادماں ہوتا نہ تھا ساتھ دسترخوان پر گر میہماں ہوتا نہ تھا
رکھتے تھے بچوں کو بھوکا اپنے مہماں کے لیے خرچ سے گھر کے سوا کھانا مہماں ہوتا نہ تھا
تھا مسافر کے لیے ایک ایک گھر مہماں سرا ہم کو کچھ غربت میں فکر آب و ناں ہوتا نہ تھا

پھر فرماتے ہیں کہ:-

پیٹ بھرلیں اپنا اور ہمسایہ فاقے سے رہے اتفاق آگے یہ اے ہندوستاں ہوتا نہ تھا
یوں نہ ہم جنسوں سے کرتی نہیں یہ آنکھیں چوریاں تو نے اپنی سی سکھادیں ہم کو تمہا خوریاں

اسلام کی ہمہ گیر برادری کا حال سنیے :-

تیرے سائے سے رہے اے ہند جب تک دور ہم اپنی یک رنگی رہی ضرب المثل بین الامم
مل گیا جو ہم میں آکر، پھر نہ تھے ہم پوچھتے روم ہے یا ترک، ارمن ہے عرب ہے یا عجم

ملت بیضا نے قوموں کی مٹادی تھی تمیز تھے بلال و جعفر و سلمان برابر محترم
زنگی و خوارزمی و تاتاری و مازندری ایک دسترخوان پر کھاتے تھے سب مل کر بہم

پھر مساوات کی شان یہ تھی :

فرق رکھا تھا کہ و مہ میں نہ کچھ اسلام نے تھے برابر نفقہ و کسوت میں آقا اور خدم
حق خلیفہ کا نہ تھا اس میں رعیت سے سوا جمع بیت المال میں ہوتی تھی آکر جو رقم
صحبتوں میں تکیہ و مسند کا آئین کم نہ تھا مجلسوں میں امتیاز صدر و پائیں کم نہ تھا

ایک اور بند میں مسلمانوں کے خلوص کی کیفیت ملاحظہ ہو:-

جس سے کرتے تھے محبت بے ریا کرتے تھے ہم جس سے ہوتی تھی شکایت برملا کرتے تھے ہم
شکوہ ہوتا تھا تو اکثر منہ پہ کہدیتے تھے ہم شکر کرتے تھے تو غیبت میں سوا کرتے تھے ہم
کام میں یاروں کے اپنے کام سب دیتے تھے چھوڑ اس میں روزے اور نمازیں تک قضا کرتے تھے ہم

ٹیپ کا شعر یہ ہے :-

تونے اے ہندوستاں کھودیں کہاں وہ یاریاں یاریاں ہم میں رہیں باقی نہ وہ غمخواریاں

پھر ایک بند میں راست گوئی، راست بازی کا ذکر آیا ہے اور ان اشعار کو پڑھ کر عبرت ہوتی ہے کہ آج کے نام نہاد مسلمان جھوٹ بولنے میں مشہور ہیں جن کے بزرگوں کا یہ حال تھا کہ :-

راست بازی میں ہماری لوگ دیتے تھے نظیر
دوست دشمن کو ہمارے قول پر تھا اعتماد
تھے ثقہ بھی ہم میں، بد اطوار بھی اوباش بھی
جیسے وہ زن اور لٹیرے تھے ہمارے راست باز
پر بنایا جب سے ہم نے ملجا و ماویٰ تجھے

قند تھی پاس سخن میں قوم کے برنا و پیر
دے چکے جب ہم زبان پھر تھی وہ پتھر کی لکیر
تھا سخن کا اپنے لیکن پاس سب کو ناگزیر
رہنماؤں میں نہیں پاتے ہم آج ان کی نظیر
راست بازی ہو گئی اے ہند ہم سے گوشہ گیر

یہ ہندوستان میں آنے سے پہلے کی کیفیت تھی، یہاں پہونچنے کے بعد شاعر کہتا ہے کہ اول اول اس ملک نے ہماری بڑی آؤ بھگت کی اور اپنی ساری دولت و حکومت، جملہ اسباب عیش و فراغت مسلمانوں کے حوالے کردیے :-

ہم میں اے ہندوستاں گو ہوئے جنسیت نہ تھی
تونے سونپی مہر و دولت ہم کو اور طبل و نشاں
تونے ثروت دی حکومت دی ریاست دی ہمیں

تو نے لیکن اپنی آنکھوں پر لیا ہم کو بٹھا
تونے بخشے قصر و ایواں ہم کو اور بستاں سرا
شکر کس کس مہربانی کا کریں تیری ادا

لیکن پھر کچھ عرصے کے بعد :-

نبھ سکیں لیکن نہ آخر تک یہ خاطرداریاں
جو دیا تھا تونے وہ آخر کو سب رکھوالیا!

شاعر کہتا ہے کہ ہمیں اس بات کا تو گلہ نہیں کہ یہ حکومت و دولت جو ہندوستان نے ہمیں دی تھی وہ واپس لے لی البتہ یہ شکوہ ضرور ہے کہ ہم جو اوصاف اور جوہر اپنے ساتھ لائے تھے وہ بھی اس بے وفا ملک نے چھین لیے اور ہمیں بالکل مفلس کردیا :-

ہم کو ہر جوہر سے یوں بالکل معرا کردیا
تونے اے آب و ہوائے ہند یہ کیا کردیا؟

شاعر سوال کرتا ہے :-

آئے تھے اے ہند یاں ہم ایسے ہی زار و نزار ہے عرب کو جن سے ننگ اور ہے عجم کو جن سے عار؟
ہم انہی اسلاف کے معلوم ہوتے ہیں خلف جن کی تھی محکوم نسل رستم و اسفندیار ؟

آگے چل کر اس انقلاب کا جو مسلمانوں میں یہاں آکر پیدا ہوا اور ان کی سابقہ خصائل کا دوبارہ نقشہ دکھایا ہے :-

جب تک اے ہندوستاں ہندی نہ کہلاتے تھے ہم کچھ ادائیں آپ میں سب سے جدا پاتے تھے ہم
اپنی خود کرتے تھے عزت گر کوئی کرتا نہ تھا سر ہر ایک فرعون کے آگے نہ نہوڑاتے تھے ہم
تھے اسے نعماے سلطانی سے بہتر جانتے اپنی محنت سے اگر نان جویں کھاتے تھے ہم
تھے نہ کرگس اور زغن کی طرح ہم مردار خوار تھا وہی قوت اپنا جو خود مار کر لاتے تھے ہم
جی چراتے تھے نہ مکروہات عالم سے کبھی اور خلاف چرخ دوراں سے نہ گھبراتے تھے ہم
حال اپنا سخت عبرت ناک تونے کردیا
آگ تھے، اے ہند ہم کو خاک تونے کردیا !

مولانا لکھتے ہیں کہ جس وقت ہم اس ملک میں آئے تو یہ اندیشہ ضرور تھا کہ آخر میں ہندوستان ہم کو دغا دے گا اور ہم بھی یہاں تباہ و برباد ہوجائیں گے جیسے پہلی قومیں یہاں آئی تھیں تباہ ہوچکی تھیں :-

تھا یقیں ہم کو کہ شامت رفتہ رفتہ آئے گی ہم کو تو اے خاک ہند آخر یونہی کھاجائے گی

چنانچہ یہ نوبت آگئی ۔ فرماتے ہیں :-

دیکھتے ہیں اب وہی آنکھوں سے صبح و شام ہم جو مداراتوں کا سمجھے تھے تری انجام ہم
توڑ ڈالے جلد تونے عہد اور پیمان سب بے وفا سنتے تھے سچ ، اے ہند تیرا نام ہم
" دیرتک رہتا ہے جو انساں نہیں رہتا عزیز " سنتے ہیں دیوار و در سے تیری یہ پیغام ہم

اور آخر میں پچھتاتے ہیں کہ کاش ہم کبھی ہندوستان نہ آتے اور یہاں کی دولت و حکومت کے لالچ میں نہ پھنستے :-

پھر گئی سرحد سے تیری فوج یوناں جس طرح کاش پھر جاتے یونہی در سے ترے ناکام ہم
رہتے قانع اپنی محنت اور مزدوری پہ کاش آ کے یاں پاتے نہ ذوق راحت و آرام ہم

دشمن اپنا ہوگیا سودائے مال و جاہ حیف
حرص نے طمعے کی، شیروں کو کیا روباہ حیف !!

یہی وہ پشیمانی ہے جس کی وجہ سے شاعر مایوس و مغموم ہو کر ہندوستان کو چھوڑ دینا چاہتا ہے۔ آپ رنج و اندوہ کی حالت میں یہ تو خبر نہ تھی کہ وہ اپنی ملت کو ایک الگ ملک بسانے اور " پاکستان " بنانے کی دعوت دے رہا ہے۔ لیکن یہ اعلان اس نے ضرور کردیا تھا کہ :-

الوداع ! اے کشور ہندوستان جنت نشاں رہ چکے تیرے بہت دن ہم بدیسی میہماں . . .

***

مسدس تسلیم بجواب مسدس حالی

مولوی سلیم الدین نارنولی مقیم جے پور متخلص بہ تسلیم

(۱) وہ قومی ترقی کے دم بھرنے والے — وہ تہذیب کے نام پر مرنے والے
وہ اسلام پر تہمتیں دھرنے والے — وہ الحاد کے حق ادا کرنے والے
وہ نقش سراپائے اورنگ قدرت — وہ محو تماشائے نیرنگ قدرت

---

(۲) وہ ہنگامہ آرائے تردید دنیا — وہ اندازہ فرمائے تدبیر دنیا
وہ تسخیر انداز تسخیر دنیا — وہ سر تا قدم نقش تصویر دنیا
وہ سرگشتۂ نفس امارہ یعنی — پرستار دنیائے مکارہ یعنی

---

(۳) عجیب السجایا بدیع الفضایل — غریب المزایا شنیع الشمایل
مضلّ البرایا ممدّ الرزائل — محل البرایا معدّ القلائل
ہے اک تازہ فرقہ ہواہ خواہ جن کا — لقب خاص ہے فطرت اللہ جن کا

---

(۴) اصول شرایع کے ابطال والے — فضول مذاہب کے اہمال والے
زر و دولت و جاہ اقبال والے — بڑے دھوکہ والے بڑی چال والے
نئی روشنی کے دکھا دینے والے — چراغ ھدیٰ کے بجھا دینے والے

---

(۵) کہوں کیا وہ کیسے ہیں کیا ہیں کدھر ہیں — بڑے نامور ہیں بڑے معتبر ہیں
ابو الجان کے خاص صلبی پسر ہیں — وجود پدر سے مگر بے خبر ہیں
ولایت(۱) میں ہے لندنی ان کی بولی — تو ہندوستان میں وہی خاص کولی(۲)

---

(۱) علی گڑھ کا قدیم نام (۲) کولی یعنی کوئل ، علی گڑھ سے مخصوص

۶) کبھی عمدة الدولہ سے ہیں ملقب　　کبھی معرفت جنگ سے ہیں مخاطب
بلا کے عقیل اور غضب کے مہذب　　ادیبوں کے اور حاکموں کے مقرب
یہ تمغے سے ان کی ہے عزت فزائی　　کہ ڈالیوں پڑے جاتے ہیں ایس آئی

---

۷) نسب میں جو فخر اب و عم و جد ہیں　　حسب میں بڑے آپ اہل خرد ہیں
بڑے معتبر ہیں بڑے معتمد ہیں　　غرض ان کے اوصاف بے حد و عد ہیں
یہ ہیں سحر اقبال لے بے بہادر　　ملا ہے خطاب ان کو خان بہادر

بناء مدرسة العلوم علی گڑھ

۱) بنا مدرسے کی جو یاروں نے ڈالی　　نئی راہ چندے کی دل سے نکالی
لگا بننے پھر ایک ایوان عالی　　جسے دیکھ کر کعبہ کہتے ہیں حالی
نہ بانی پئی دست از حق بشوید　　قلندر چو گوید ہمہ دیدہ گوید

---

۲) بشارت ہو اے آشتیان نیچر　　علی گڑھ میں ہوتا ہے اب حج اکبر
یہ حج ہے کہیں حج لندن سے بہتر　　کہ ہے مدرسہ کعبہ اور اس کے در پر
کسی کا دل پاک ہے سنگ اسود　　پڑھو کہہ کے لبیک یا سید احمد

---

۳) یہ والا گہر سید خاندانی　　ہیں اس کعبۂ نیچریت کے بانی
عرب میں جو ہے کعبۂ باستانی　　وہ حضرت کے در در کی ہے کاروانی
یہ جو مدرسہ کول میں بن رہا ہے　　وہ کعبہ بنایا ہوا آپ کا ہے

---

۴) یہی دین نیچر کے ہیں خاص مرسل　　یہ نیچر الہی کا ہے وحی منزل
یہی چاہتے ہیں کتاب مفصل　　انہی پر کھلا ہے ہر اک راز مجمل
عیاں ہیں نبوت کے مصداق ان کے　　صحیفے ہیں تہذیب اخلاق ان کے

---

۵) کھلے ان صحیفوں سے اسرار مذہب — کہ حل ہوگئیں دین کی مشکلیں سب
نکالے گئے ٹھیٹ اسلام کے ڈھب — مسلمان ہونے لگے کچھ مہذب
یہ ہے ان صحیفوں کی اصل مقدر — کہ ہے نیچر اسلام اسلام نیچر

---

۶) یہ ٹھہرا ہے ایمان کا رکن اول — کہ نیچر ہے دنیا کے دینوں سے افضل
مثیل ایک تھے نیچری مکمل — اور ان سے ہی تھے نیچری سارے مرسل
اور اس پر ہی کیا حصر نیچر گری ہے — خدا ایک پکا چھٹا نیچری ہے

---

۷) نبوت کہاں اور کہاں نیچری پن — نبی امتی ٹھہرے اور السفی فن
اور اس سے زیادہ یہ کفر مبرہن — کہ ہے خاک شاں در دھن خون بگردن
خدا کو بھی دیتے ہیں نیچر میں جکڑے — رسول ان کو سمجھے خدا ان کو پکڑے

---

۸) یہ ہے نیچریت کا قول مقرر — کہ اسلام کا نام اصلی ہے نیچر
اور اسلام والے ہیں باہم برادر — خدا نیچری ٹھہرے اللہ اکبر
تو اب نیچریوں کی اچھی بن آئی — کہ ٹھہرے خدا سے دو عالم کے بھائی

---

۹) یہ راہیں انہوں نے نئی ہیں نکالی — نئی مشکلیں ہیں شریعت نے ڈالی
اپج ہے انوکھی گھڑت ہے نرالی — غرض یہ تکلف ہیں سارے خیالی
نہ تاویل میں کچھ نہ تفسیر میں کچھ — نہ تبدیل میں کچھ نہ تغییر میں کچھ

---

۱۰) کلامی بنا فلسفہ کر کے قایم — جماتے ہیں ارکان دین کے دعایم
لگاتے ہیں کیا کیا خیالی ضمایم — اٹھاتے ہیں کیا کیا قیاسی قوایم
دلائل پہ رکھتے ہیں بنیاد ملت — شریعت کو کرتے ہیں محتاج ملت

---

(۱۱) کہیں اشعریہ کی ہے موشگافی کہیں ماتریدیہ کی ژندہ بافی
نہ قرآن کافی نہ اخبار کافی اگر مسند ہے نہ رائے حلالی
خیالات کے پڑ رہے ہیں بکھیڑے مقالات کے چل رہے دڑبڑے

---

(۱۲) نہ ہو پنج گانہ تو ہے کیا قباحت مقدم ہے انسان کو اپنی راحت
نہ قرآن میں پانچ کی ہے صراحت نہ اسلام میں منع ہے اباحت
غرض گنڈے دار ایک وجیسی نیسی ادا ہو تو اس میں خطا کیا ہے ایسی

---

(۱۳) زکواۃ معین کہ فرض خدا ہے وہ قرآن میں جس پہ حق کی بنا ہے
بیاسی جگہ ذکر اس کا ہوا ہے ادا ہو نہ ہو نام ایک ٹیکس کا ہے
مگر کالج کے مدرسہ کا دو چندہ نہ دے تو مواخذ ہے ایک ایک بندہ

---

(۱۴) لگی یہ نئی رائے تشریحی حج کہ کعبہ کو جانا ہے رسم مروج
ولایت کی گلگشت ہے کام کا حج ترقی و تہذیب کے صاف منہج
وہیں سے ہے تہذیب اخلاق حاصل وہیں ہیں کمالات آفاق حاصل

نیچری جہاد کیا ہے ؟

(۱۵) جہاد و غزا کی جو تھی تیغ رانی وہ تھی بدر و اسلام کی کاردانی
مگر اب تو یہ مصلحت ہے زمانی کہ ہو صرف تیغ زبان کو روانی
یہی تو ہے جس کو یہ ہو استقامت کہ ما من الیٰ حین یوم القیامت

وحی و الہام کے بارے میں نیچر کی رائے

(۱۶) بتائیں تمہیں وحی و الہام کیا ہیں تنزل کے دعوے نرے ادعا ہیں
یہ سب فطرت عام کے اقتضا ہیں ہر اک آدمی کے طبیعی قویٰ ہیں
کسی میں ہیں کم اور کسی میں زیادہ مگر مادہ سب میں ہے بے ارادہ

(۱۷ ہوا فیصلہ وحی و الہام کا جب ہوا حق ادا حق کے احکام کا جب
اٹھا تفرقہ خاص اور عام کا جب مٹا حرف اسلام کے نام کا جب
تو بس اب نہ کوئی نبی ہے نہ مرسل فقط نیچری بن ہے وحی منزّل

سرسید احمد خاں کے خاص خاص حواریوں کے شان میں

(۱۸ بڑے کام کے ہمارے دو تھے حواری کہ کرتے تھے احکام تشریع جاری
انہی کو تھی تہذیب کی پاسداری انہی سے تھی نیچر کی خدمت گذاری
چراغ (۱) ان کی تہذیب کے ٹمٹماتے تو آئینہ مہدویت (۲) دکھاتے

منشی ذکاءاللہ صاحب مرحوم پروفیسر

(۱۹ وہ اک ان میں اوہام عقلی کے واہی (۳) کہ ہیں نام کے آفتاب الٰہی
ریاضی و راضی کے ماہر کما ہی تواریخ کے ماہر بے تناہی
عروج خیالات میں سب سے اونچے ہر اک طور کی قید مذہب سے اونچے

(۲۰ خداوند عالم کو رب (۴) کہنے والے نبی کو حکیم عرب کہنے والے
شرایع کو دنیا کے ڈھب کہنے والے عقاید کو قومی ادب کہنے والے
عقیدے میں پورے مقولے پھپکے کہ ہیں برزخ و حشر قومی ڈر کے

(۲۱ خیالات ان کے مضامین ان کے مقالات ان کے براہین ان کے
قیاسات ان کے قوانین ان کے غرض دین میں ہیں فرامین ان کے
انہیں سے ہے تحقیق انواع مذہب انہیں سے ہے قانون فطرت مرتب

خطاب بہ مولانا حالی

(۲۲ وہ ہیں دوسرے صاحب طبع حالی فن نظم میں ہم صفیر زلالی (۵)
بہت کچھ ہے ان کا عروج کمالی ہر اک قال کے راز ہیں جن پہ حالی

---

(۱) چراغ علی (۲) مولوی مہدی علی (۳) دانا (۴) باپ (۵) ایک شاعر کا تخلص

یہ کچھ لطف گفتار ہے کام ان کا — کہ مجموعۂ لطف (۱) ہے نام ان کا

---

(۲۳) مگر آپ ہیں ناظم مسلک نیچر — سخن آپ لکھتے ہیں دفتر کے دفتر
صفائے بیاں کا یہ بدلا ہے پیکر — کہ ہر شعر ہے آپ کا موج گوہر
نئی ٹھیٹھ اردو کی یہ شد و مد ہے — کہ بھاشا کے الفاظ لانے میں کد ہے

---

(۲۴) سخن میں نیا ڈھنگ ہے خوب ڈھب ہے — طبیعت میں ایجاد طرز عجب ہے
کلام آپ کا جو ہے سو منتخب ہے — مد و جزر اسلام لیکن غضب ہے
مد و جزر اسلام یعنی مسدس — مسدس کہو یا کتاب مقدس

---

(۲۵) بہت شور ہے اہل نیچر میں اس کا — فصاحت بلاغت کے ہوتے ہیں غوغا
لگایا ہے نیچر کے مرسل نے فتوا — کہ یہ نظم ہے سارے عالم میں یکتا
نہیں مثل کا اس کے امکان ہرگز — یہ اک وحی نیچر میں ہے نظم معجز

---

(۲۶) بڑے ناز سے اس کے اشعار پڑھکر — سنا ہے کہ فرماتے تھے پیر نیچر
اگر مجھ سے پوچھا گیا روز محشر — عمل کونسا لائے ہو سب سے بہتر
تو حاضر کروں گا یہی نظم حالی — پئے ہدیۂ حضرت لا یزالی

---

(۲۷) ذرا آپ سے کوئی پوچھے کہ حضرت — قیامت کے ہونے پہ تو اہل فطرت
نہیں مانتے کوئی دعویٰ و حجت — بھلا آپ کو کیا ہے محشر سے نسبت
کہ یہ اعتقاد اہل اسلام کا ہے — نہ قانون نیچر کے احکام کا ہے

---

(۱) یعنی الطاف حسین حالی۔

اس مسدس کا یہ ایک حصہ ہے۔ جو مضحکات و مطائبات سرسید صفحہ ۲۰۲ مؤلفہ سرخوش سے ماخوذ ہے۔ نہیں معلوم اصل مسدس کتنا بڑا ہے۔ اس میں مولوی سلیم الدین نے پیٹ بھر کر سرسید اور مولانا حالی کو کوسا ہے اور ان کے رفقائے کار کو بھی ان کے ساتھ ہی لے ڈالا ہے۔ سرخوش نے لکھا ہے کہ اس واقعہ کے بعد حضرت تسلیم نے مولانائے موصوف کی تعریف میں کچھ لکھ کر بھیجا تھا اور حضرت حالی نے اس رباعی میں اس کا اعتراف کیا ہے جب کہ شعر و شاعری کے مشغلے سے بوجہ امراض وہ سبک دوش ہوچکے تھے۔

رباعی

جوش خم بادہ جام خالی میں ہوا — پھر ولولہ پیدا دل حالی میں ہوا
تسلیم نے دی اس طرح کچھ دادسخن — شک مجھ کو بھی اپنی بے کمالی میں ہوا

لیکن یہ صحیح نہیں ہے۔ اس لیے کہ مولانا حالی نے جس تسلیم کا ذکر اپنی رباعی میں کیا ہے وہ منشی امیر اللہ تسلیم ہیں جو اردو شاعری کے مشہور اساتذہ میں گزرے ہیں۔

(ادارہ)

قاضی احمد میاں اختر جوناگڑھی نے انجمن ترقی اردو پریس میں چھپوا کر شایع کیا